# نادیدہ بہاروں کے نشاں کا تنقیدی مطالعہ

## مقالہ برائے ماسٹر آف فلاسفی


مقالہ نگار

شیخ۔شاکرہ

نگران

پروفیسر مظفر علی شہ میری

شعبۂ اُردو

یونیورسٹی آف حیدرآباد

حیدرآباد ۵۰۰۴۶

# DECLARATION

I **Shaik shakira** hereby declare that this dissertation entitled ***NOVEL "NADEEDA BAHARON KE NISHAN" KA TANQIDI MUTALA*** submitted by me under guidance and supervision of **Prof. Muzaffer Ali Shahmiri** is a bonafide research work which is also free from plagiarism. I also declare that it has not been submitted previously in part or in full to this University or any University or Institution for the award of any degree or diploma. I hereby agree that my dissertation can be deposited in shodganga/INFLIBNET.

Date: Name:

Signature of student

Regd No:

//Countersigned//

Signature of the supervisor(s):

# ’نادیدہ بہاروں کے نشاں‘ کا تنقیدی مطالعہ

# فہرستِ ابواب


| | |
|---|---|
| پیش لفظ | 3-5 |
| پہلا باب:۔شائستہ فاخری کی سوانح وشخصیت | 7-26 |
| دوسرا باب:۔شائستہ فاخری کی ادبی خدمات کا اجمالی جائزہ | 28-53 |
| تیسرا باب:۔ناول نادیدہ بہاروں کے نشاں کا تنقیدی مطالعہ | 55-85 |
| ماحصل | 87-89 |
| کتابیات | |

# پیش لفظ

شائستہ فاخری دورِ حاضر کی خواتین فکشن نگاروں میں ایک اہم مقام ومرتبہ رکھتی ہیں۔ ہندی اور اردو دونوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھنے والی اس ادیبہ کی کئی کتابیں شائع ہوکر منظرِ عام پر آچکی ہیں۔انھوں نے افسانے ہی نہیں بلکہ ناول، ڈرامے بھی لکھے ہیں اور شاعری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔تاہم انھیں شہرت افسانہ نگاری کی وجہ سے حاصل ہوئی۔

شائستہ فاخری اردو فکشن کا وہ ابھرتا ہوا نام ہے جو افسانوی دنیا کے ہجوم میں اپنی الگ شناخت رکھتا ہے۔ انھوں نے اپنا قلم خواتین کے مسائل کے لیے اٹھایا ہے۔اور جدید دور کی خواتین کے مسائل کو ایک نئی تکنیک کے ذریعہ پیش کیا ہے،اور یہ تکنیک روایت سے قریب ہونے کے باوصف اس سے الگ بھی ہے۔

مجھے شروع ہی سے اردو ناول سے دلچسپی رہی ہے۔چناں چہ جب ایم۔فل میں موضوع کے انتخاب کا مرحلہ آیا تو میں اردو تانیثیت پر مبنی کسی ناول پر کام کرنا چاہتی تھی۔کیونکہ ناول میں عورت کے مسائل ہی نہیں بلکہ اس کی ساری زندگی مکمل طور پر پیش کی جاسکتی ہے۔اسی لیے میں نے صدرِ شعبۂ اردو پروفیسر مظفر علی شہ میری کے مشورے پر اپنا موضوعِ تحقیق شائستہ فاخری کا ناول ''نادیدہ بہاروں کے نشاں'' کا انتخاب کیا اور میرا موضوع ''نادیدہ بہاروں کے نشاں کا تنقیدی مطالعہ'' طے پایا۔

میں نے اپنے مقالے کو تین ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

پہلا باب:۔شائستہ فاخری کی سوانح وشخصیت

دوسرا باب:۔شائستہ فاخری کی ادبی خدمات

تیسرا باب:۔ناول نادیدہ بہاروں کے نشاں کا تنقیدی مطالعہ

ماحصل

پہلے باب میں شائستہ فاخری کی سوانح حیات کو تفصیلی طور پر پیش کرنے کے ساتھ ان کی شخصیت کے اہم پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں ان کی خدمات کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ جبکہ تیسرے اور اہم باب میں ان کے ناول 'نادیدہ بہاروں کے نشاں' کا مدلل تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ اور آخر میں ماحصل کے تحت اس تحقیق سے دریافت شدہ حقائق کو پیش کیا گیا ہے۔

شکریہ کے فرائض میں سب سے پہلے صدرِ شعبۂ اردو اور میرے نگران کار پروفیسر مظفر علی شہ میری کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے دورانِ تحقیق مجھے پورا وقت دے کر میری رہنمائی فرمائی۔ انھوں نے موضوع پر کام کرنے کی نہ صرف اجازت دی بلکہ اس موضوع کو طے کرنے میں ان کی بڑی مدد شاملِ حال رہی۔ شعبے کے دیگر اساتذہ میں پروفیسر محمد انور الدین، پروفیسر رضوانہ معین، ڈاکٹر حبیب نثار، ڈاکٹر عرشیہ جبیں، ڈاکٹر اے۔ آر۔ منظر، ڈاکٹر محمد کاشف، ڈاکٹر نشاط احمد، اور ڈاکٹر زاہد الحق کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے وقتاً فوقتاً میری حوصلہ افزائی کی۔

میں شائستہ فاخری صاحبہ کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں کہ موصوفہ نے اس مقالے کی تکمیل میں میرا بہت ساتھ دیا اور جب بھی مجھے مواد کی ضرورت پڑی تو email کے ذریعہ مجھے مواد فراہم کیا۔ اور وہ بہت ہی محبت کے ساتھ میرے سوالوں کے جواب دیتی رہیں۔

میں خوش قسمت ہوں کہ اس مقالے کی تکمیل میں مجھے میرے والدین اور میرے عزیز بھائیوں کی محبت و شفقت حاصل رہی۔ میں اپنے والدین کی شکر گذار ہوں کہ انہوں نے مجھے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع دیا۔ ان ہی کا نتیجہ ہے کہ میں یہاں تک پہنچ پائی ہوں۔

میں اپنے دوست ایس۔ ٹی۔ نور اللہ کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جن کے تعاون سے یہ مقالہ آج پائیہ تکمیل کو پہنچا ہے۔ یہی نہیں اس مقالے کی کمپوزنگ بھی ان ہی کے ہاتھوں ہوئی ہے۔

میرے ہم جماعتوں میں جی۔ بی بی۔ عائشہ، نسرین صدیقہ، شیخ آشا، وی۔ رفاقت علی، بی۔ امجد علی خان کا بھی میں

شکریہ ادا کرتی ہوں۔ان کے علاوہ میرے سینروں میں سی۔فوزیہ،شیخ۔شہباز،شیخ۔مہتاب اور میرے جونیروں کا بھی تہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔

شیخ۔شاکرہ

ایم۔اے

# پہلا باب: شائستہ فاخری کی سوانح حیات و شخصیت

## آباواجداد:۔

شائستہ فاخری کے آباواجداد کے تعلق سے دوایک کتابوں میں مواد دستیاب ہے۔تاہم نظام الدین کی تصنیف ''تاریخِ مشائخِ الہ آباد'' میں جوتفصیلات درج ہیں وہ زیادہ مستند معلوم ہوتی ہیں۔ذیل میں جومعلومات فراہم کی گئی ہیں وہ اسی تصنیف سے ماخوذ ہیں۔

شائستہ فاخری کا شجرہ سلسلۂ نسب حضرت شاہ محمد افضل عباسیؒ سے جاملتا ہے۔جوشمالی ہندوستان میں شہرِ الہ آباد کی ادبی وتمدنی تاریخ میں دائرہ شاہ محمد اجمل کوخاص اہمیت حاصل ہے۔صدیوں سے یہ دائرہ علم وفضل کا مرکز خصوصی،تہذیب وتمدن کا گہوارہ بنارہا ہے۔بانیٔ دائرہ شیخ محمد افضل الہ آبادی وہ عظیم شخصیت ہیں جنہوں نے اس دائرہ کی چارسوسال پہلے بنیادڈالی۔آپ نے سلسلۂ چشتیہ میں بعیت کی لیکن تعلیم وتربیت سلسلۂ قادریہ کی ہوئی تھی۔بادشاہ وقت عالم گیر کے عہدِ حکومت میں اس دائرہ کا انعقاد ہوا تھا۔عالمگیر نے شیخ کے لئے ایک مکان مسکون وموسوم بہ محل ایک مسجد اور ایک خانقاہ بھی تعمیر کروائی۔جواپنے نئے رنگ وروغن کے ساتھ اب بھی موجود ہے۔

ان کے بعد حضرت شاہ محمد یحییٰ معروف شاہ خوب اللہ الہ آبادیؒ جو شیخ محمد افضل الہ آبادی کے بھتیجا و داماد جواپنے چچا پیرومرشد کی وفات کے بعد مسندِ سجادگی پر جلوہ افروز ہوئے۔ان کے تین صاحبزادگان تھے۔علامہ شاہ محمد طاہر،شاہ محمد فاخر زائر محدث اور شاہ محمد ناصر افضلی۔

شاہ خوب اللہ کے انتقال کے بعدان کے بڑے بیٹے شاہ محمد طاہر اپنے عہد کے سجادہ نشین ہوئے۔لیکن وہ لاولد انتقال فرمائے۔ان کے بعدان کے منجھلے بھائی حضرت شاہ محمد فاخر زائرؒ محدث اور دلی کابل تھے۔انھیں فقہ میں مجدد اورامامِ وقت کا مرتبہ حاصل تھا۔ان کے بعد حضرت شاہ محمد ناصر افضلیؒ کا نام اس دائرہ کی عظیم المرتبت علم پرست اور عالمِ

دوست شخصیتوں میں آتا ہے۔انھوں نے بھی خاندانی روایات کے اعتبار سے مجلّہ علومِ عربیہ وفارسیہ والد ماجد کی طرح علم پرستی عالمِ دوستی میں کم سنی میں شہرت وعزت حاصل کرلی۔آپ کے بعد حضرت شاہ غلام قطب الدین مصیب مکیؒ جو حضرت شاہ فاخر زائر محدثؒ کے صاحب زادہ تھے۔ابتدائی تعلیم والداور دیگر بزرگانِ خاندان سے حاصل کی پھر یہ سلسلہ چلتا رہا اور تقریباً دوسوسال پہلے چوتھے سجادہ نشین حضرت شاہ محمد اجمل سجادہ نشین ہوئے۔تاریخی اسباب کی بناپر انہیں کے نام پر یہ دائرہ شاہ اجمل مشہور ہوگیا۔اور خانقاہ اجمل کہلایا۔اس دائرہ کے شاہ محمد وہ عظیم شخصیت ہیں جنہوں نے علومِ اسلامیہ کی تبلیغ و اشاعت کے علاوہ فارسی ادب کی اشاعت وترویج کی طرف خصوصی توجہ دی۔جس کی وجہ سے اس دائرہ کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔اس دائرہ میں ہندوستان اور بیرون ہندوستان کے علما وشعرا کی آمد کا سلسلہ رہتا تھا۔پھران کے انتقال کے بعدان کے فرزند شاہ ابوالمعالی عالیؒ نے بھی اپنے والد وماجد کی طرح علم پرستی وشاعر پروری کا مزاج پایا۔اس خانقاہ اجمل کے آٹھویں سجادہ نشین مولانا محمد فاخر بیخود رشتے میں شائستہ فاخری کے پردادا تھے۔

## پردادا:۔

شائستہ فاخری کے پردادا مولانا محمد فاخر بیخود عرف حضرت مولانا ارشد میاں والد ماجد حضرت شاہ حاجی خاںؒ نے حضرتِ سیدنا کی سرکار میں حاضری کے موقع پر سلسلۂ چشتیہ میں بعیت لی اور اذن واجازت سے سرفراز کیا۔پھر عمر مکرم شاہ محمد بشیر الدین،شاہ علی کبیر عرف شاہ میر پٹھان نے مجاز ومازون کیا۔مولوی محمد سے سلسلۂ قادریہ میں اجازت حاصل کرلی۔

## دادا:۔

شائستہ فاخری کے دادا حضرت مولانا شاہد میاں فاخری دائرہ شاہ اجمل کے علم وعمل کی فضا میں آنکھ کھولی۔ صرف ۱۹ سال کے تھے کہ ۱۹۲۰ میں تحریکِ خلافت وکانگریس کے سلسلہ میں گرفتار کرلیے گئے۔مولانا کو ہر صنف میں سر فرازی حاصل تھی اعزا میں سربلند،شہر میں محترم،ملک میں مقتدر جمیعۃ العلمائ ہند کے مستقل نائبِ صدر اور صوبائی جمیعت کے

صدرِ کونسل کے ممبر، اسمبلی کے رکن، پارلیمانٹری کے سیکریٹری، حج کمیٹی کے ذمہ دار آفیسر اور ڈائرکٹر مغل لائن وقف بورڈ کے صدر رہ چکے تھے۔

مولانا کے چار صاحب زادہ جن میں ایک مولانا الحاج سید محمد خالد فاخری، دوسرے سید محمد زاہد فاخری ،تیسرے حاجی سید محمد ناصر فاخری اور حاجی سید محمد طاہر فاخری۔انہوں نے اپنی اولاد کو خاندانی روایت کی پابندی اور دینی عظمت کو برقرار رکھنے کو نصب العین جاننے کی تعلیم دی۔

دائرہ شاہ اجمل الہ آباد کا ایک ایسا مقام ہے جو آج بھی مرجعِ خلائق ہے۔اب حضرت الحاج سید محمد ناصر فاخری دسویں سجادہ نشین ہیں۔کیونکہ ان کے سب سے بڑے بھائی پاکستان چلے گئے اور جب یہ گدّی نشینی سید محمد زاہد فاخری کے سر آئی تو انہوں نے اپنے قدم پیچھے کر لیے کہ وہ ایک سرکاری آفسر ہیں۔نوکری کے ساتھ ساتھ گدی نشینی کی ذمہ داری مشکل مرحلہ ہے۔اس لئے یہ پگڑی سید محمد ناصر فاخری کے سر پر باندھی گئی جو موجودہ سجادہ نشین ہیں۔[۱]

**والد:**

شائستہ فاخری کے والد کا نام سید محمد زاہد فاخری ہے۔جو چار بھائیوں میں دوسرے نمبر پر تھے۔وہ ایک سرکاری افسر ہیں پہلے انھوں نے پبلیسٹی آفسر کے طور پر کام کیا، پھر انفارمیشن آفیسر ہوئے ،اور اس کے بعد ایکسٹنشن آفیسر آل انڈیا ریڈیو پر اعلیٰ افسر ہوئے۔ان کی بیوی صالحہ فریدی ہیں۔

سید محمد زاہد فاخری اور صالحہ فریدی کی کل سات اولادیں ہوئے ہیں۔دو بیٹے اور پانچ بیٹیاں ان میں سے غزالہ شہناز، سہلا حسن ناز، شائستہ فاخری، زریں فاخری، آصفہ فاخری، سید افضال فاخری، سید فضل فاخری۔

شائستہ فاخری نے اپنے آباواجداد دائرہ شاہ اجمل کے تعلق سے رسالہ شاعر میں یوں لکھتی ہیں:

> ''دائرہ شاہ اجمل کی بنیاد ایک بزرگ حضرت شیخ محمد افضلؒ نے تقریباً چار سو سال پہلے ڈالی ان کے بعد ان کے بھتیجے اور داماد حضرت شاہ خوب اللہ خلیفۂ اول مقرر ہوئے۔پھر یہ سلسلہ چلا اور تقریباً دو سو سال پہلے چوتھے سجادہ نشین حضرت سید شاہ محمد

اجمل سجادہ نشین ہوئے۔تاریخی اسباب کے بنا پرانہں کے نام پر یہ دائرہ شاہ اجمل مشہور ہو گیا اور خانقاہ اجمل کہلایا۔خانقاہ اجمل کے آٹھویں سجادہ نشین حضرت مولانا شاہ محمد فاخر بیخود الہ آبای ہوئے۔جنہوں نے جنگِ آزادی کی صعوبتیں برداشت کیں۔جنگِ آزادی میں حصہ لینے والے علما میں وہ پہلے عالمِ قیدی تھے جو خلافت تحریک اور عدمِ تعاون کی بنا پر گرفت گئے۔بیڑیوں اور ہتھکڑیوں میں جکڑ کر انہیں سزائے سخت دی گئی۔انہیں کے ساتھ بعد میں ان کے بیٹے دائرہ شاہ اجمل کے نویں سجادہ نشین حضرت مولانا الحاج حافظ سید شاہ محمد شاہد فاخری بھی جنگِ آزادی میں جیل گئے۔جو میرے پردادا تھے۔ہم لوگ اپنے ناموں کے لاحقے میں فاخری اسی رعایت سے لکھتے ہیں۔دائرہ شاہ اجمل الہ آباد کا ایک ایسا مقام ہے جو آج بھی مرجعِ خلائق ہے۔اب حضرت الحاج سید محمد ناصر فاخری دسویں سجادہ نشین ہیں''۔[۲]

شائستہ فاخری کا تعلق جس خانوادہ سے رہا ہے اس کا سلسلہ عالیہ، چشتیہ، نظامیہ، نصریہ، محمدیہ، افضلیہ سے ہوتا ہوا فاخریہ تک پہنچا ہے۔

حضرت شاہ محمد افضل عباسی

حضرت شاہ خوب اللہ الہ آبادی

علامہ شاہ محمد طاہر　　شاہ محمد فاخر زائر　　شاہ محمد ناصر افضلی

حضرت شاہ غلام خطیب الدین مصیب مکی　　حضرت شاہ محمد اجمل الہ آبادی

شاہ ابوالمعالی عالی

حضرت شاہ غلام حیدری محمدی　　حضرت شاہ محمد جان قدسی　　حضرت شاہ سید علی جعفر

حضرت شاہ حاجی جان

حضرت مولانا ارشد میاں

حضرت مولانا شاہد میاں فاخری

مولانا الحاج سید محمد خالد فاخری　　سید محمد زاہد فاخری　　سید محمد ناصر فاخری　　حاجی سید محمد طاہر فاخری

غزالہ شہناز　سہلا حسن ناز　شائستہ فاخری　زریں فاخری　آصفہ فاخری　سید افضال فاخری　سید فضل فاخری

## شائستہ فاخری کی پیدائش اور بچپن:۔

شائستہ فاخری کا اصلی نام شائستہ ناز اور قلمی نام شائستہ فاخری ہے۔ان کی پیدائش ۱۷ نومبر ۱۹۶۳ کو سلطان پور (یوپی) میں ہوئی۔ان کا بچپن پیری، مریدی، جھاڑ پھونک، نذر نیاز اور تعویز گنڈے کے ماحول میں پروان چڑھا۔مگر جیسے جیسے ان کا شعور بالغ ہوتا گیا یہ عمل خود بہ خود انھیں بے معنی لگنے لگے۔شائستہ کو سچ مچ لوگوں سے ملنا جلنا اچھا نہیں لگتا تھا ۔اس معاملے میں خود وہ رقم طراز ہیں:

''بچپن میں میرے متعلق گھر کے بزرگوں کی عام رائے تھی کہ یہ بڑی بے نیاز اور خاموش بچی ہے۔سچ مچ مجھے لوگوں سے ملنا جلنا اچھا نہیں لگتا تھا۔اس وقت میری عمر تقریباً چار پانچ برس کی رہی ہوگی۔میں اپنے اللہ پاک سے ایک ہی دعا مانگا کرتی تھی کہ یا اللہ تو میری زبان کاٹ دے تو مجھے بولنا نہ پڑے۔یہ دعا تب تک جاری رہی جب تک میرا شعور بالغ نہیں ہوا۔مجھے گھر کے کونے میں بیٹھ کر سوچتے رہنا، کچھ دیکھتے رہنا اچھا لگتا تھا۔کیا سوچتی تھی خلا میں کیا تکتی اب کچھ یاد نہیں''۔[۳]

علی احمد فاطمی نے شائستہ کے شخصی خاکہ میں ان کے متعلق یہ اظہارِ خیال کیا ہے:

''شائستہ بچپن ہی سے اپنے بھائی بہنوں میں قدرِ مختلف و منفرد تھیں۔الگ تھلگ دبے: ہم جب کبھی زاہد صاحب کے گھر جاتے دیگر بچوں سے ملاقات ہوتی لیکن شائستہ سے کم ہو پاتی اور جب کبھی ملاقات ہوتی بھی تو اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ آپ ایک کم سن لڑکی سے مل رہے ہیں۔شائستہ کو ضرورت سے زیادہ شائستہ مہذب بنائے رکھتیں''۔[۴]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شائستہ فاخری کا بچپن دوسرے بچوں سے بالکل الگ تھا۔

تعلیم :۔

شائستہ فاخری کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ پھر الہ آباد یونیورسٹی سے ایم۔اے (سنسکرت) کا امتحان کامیاب کیا۔ان کی تعلیم وتربیت اور ادبی ذوق کو پروان چڑھانے میں خود ان کا خاندانی خانقاہی ماحول شامل ہے۔انہوں نے اس بات کی وضاحت اپنے افسانوی مجموعہ 'اداس لمحوں کی خودکلامی' میں میرا تخلیقی سفر کے حوالے سے کی ہیں:

''ہمارا خاندان الہ آباد کی مشہور درگاہ دائرہ شاہ اجمل سے وابستہ ہے۔میرے والد محترم جناب سید محمد زاہد فاخری خانقاہ دائرہ شاہ اجمل کے سجادہ نشین مولانا شاہد میاں فاخری مرحوم کے صاحبزادہ تھے۔میری تعلیم و تربیت اور ادبی رجحان کو پروان چڑھانے میں میری والدہ صالحہ فریدی کا شب وروز حصہ رہا ہے۔آج جہاں میں کھڑی ہوں وہ سب انہیں کی محنت اور کرم فرمائیوں کا نتیجہ ہے۔میرے اپنے گھر کی فضا پوری طرح مذہبی اور ادبی تھی۔ہم سات بھائی بہن اپنے والدین کے ساتھ خانقاہ ملحق ایک دوسرے گھر میں مقیم تھے۔میری پیدائش سلطان پور میں ہوئی کیونکہ جناب والد محترم اپنی ملازمت کے تعلق سے ٹرانسفر پر وہیں تھے۔مگر میری تعلیم و تربیت الہ آباد میں ہوئی''۔۵

شائستہ فاخری نے اپنی تعلیم سنسکرت زبان میں حاصل کررہی تھیں۔لہذا دائرہ شاہ اجمل کے مذہبی ماحول میں ان کا اس زبان میں تعلیم حاصل کرنا بڑی جرأت کی بات تھی۔اس سلسلے میں علی احمد فاطمی رقم طراز ہیں:

''شائستہ اس وقت سنسکرت میں ایم۔اے کررہی تھیں۔میرے لئے یہ ایک جھٹکا تھا۔دائرہ شاہ اجمل کے اسلامی و مذہبی ماحول کے پروردہ ایک لڑکی سنسکرت سے

ایم۔اے کر رہی ہے۔مقامِ حیرت تھا لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا کہ شائستہ کے فکر و عمل میں تحیر زیادہ ہوا کرتا تھا کل بھی آج بھی۔اس معاملے میں بھیا نے اپنی بیٹی کا ساتھ دیا۔اوران معاملات میں ان کی بیگم صالحہ بھابھی ان کی غیر معمولی معارفت کی تھیں۔بچیوں کو ہمت ونڈر بنانے میں ان کا اہم رول ہے، ہر چند کہ اس کی مادری زبان اردو تھی۔تاہم انحراف کی کیفیت تو باغیانہ فیصلے کو ہی مدعو کرتی ہے۔اردو مادری زبان ہونے کے باوجود شائستہ نے ایک مضمون کی حیثیت سے بی۔اے میں جا کر پڑھی۔بی۔اے کرنے کے بعد اس نے سنسکرت سے ایم۔اے کرنے کا فیصلہ لیا۔اس فیصلے میں بھی ایک طرح کی بغاوت اور سرکشی پوشیدہ تھی۔جو سب سے الگ ۔روایت سے مختلف ومنحرف ۔تو یہ تھا اس کا ہندی اور سنسکرت کی طرف رجوع کرنے کا معاملہ جو میں بعد میں سمجھ سکا''۔[۶]

شائستہ نے ایم۔اے مکمل کرنے کے بعد پی ایچ ڈی میں داخلہ لیا اور سنسکرت کے افسانے کی پوری تاریخ پر کام کیا' وید سے لے کر جاتک کتھاوں، پران رامائن مہابھارت اور اکیسویں صدی کے افسانے تک کے سفر کا گہرا مطالعہ کیا۔ایک تعجب وفکر انگیز بات یہاں یہ تھی کہ دائرہ شاہ اجمل کے اسلامی مذہبی ماحول کی ایک لڑکی سنسکرت سے تعلیم حاصل کر کے اتنا بڑا کام کر رہی تھیں۔اس کی وجہ شائستہ نے یہ بیان کی ہے:

''میرے گھر کا ماحول بہت اسلامی وادبی تھا۔میرے والد کا جھکاؤ شروع سے دین و مذہب کی طرف تھا۔انہیں ادب میں بھی خاص دلچسپی تھی۔شام ہوتے ہی جب آفس سے وہ آجاتے تو دیر رات تک ڈرائنگ روم اس قسم کی گفتگو میں دلچسپی رکھنے والے لوگوں سے بھرا رہتا تھا۔جب میں نے پہلی کہانی لکھی اس کہانی پر میرے والد کا ردِعمل خاموشی کا تھا۔مگر ناگواری انکے چہرے پر تھی۔جس نے مجھے خوف زدہ

کر دیا خوف کا پہلا بیج میرے خمیر میں داخل ہوا اور میں نے اپنی ادبی زندگی کی پناہ ہندی اور سنسکرت زبان میں ڈھونڈنی شروع کر دی''۔ ۷

## مشاغل:۔

شائستہ فاخری کو بچپن ہی سے کتابوں کا مطالعہ کرنا بہت پسند تھا۔ وہ بچپن سے اپنے آپ کو مشغول و مصروف رکھتی تھیں۔ کچھ کچھ سوچتی کچھ کچھ لکھتی تھیں ۔اس سلسلے میں شائستہ فاخری رسالہ شاعر میں لکھا تھا:

''مطالعہ کا شوق مجھے بچپن سے ہی رہا ہے۔ مجھے ہندی اردو میں جو بھی اہم کتاب ملتی تھی انہیں دلچسپی سے پڑھتی تھی۔ چونکہ جس زمانے میں میرا اپڑھنے کا رجحان پروان چڑھ رہا تھا اس زمانے میں اس شہر میں اس ابنِ صفی، شکیل جمالی، راہی معصوم رضا اور ابنِ سعید کے ناولوں کا پورے ہندوستان میں بڑی شدت سے انتظار رہتا تھا۔ میں بھی چھپ چھپا کر یہ سب پڑھتی رہتی تھی۔ اس طرح ہندی کے ناول بھی پڑھے، انگریزی کے ناول تو زیادہ نہیں پڑھے، لیکن اردو میں جن ناولوں کے ترجمے مل سکے انہیں چھوڑا ابھی نہیں''۔ ۸

چناں چہ ان کا زیادہ تر وقت ادبی کاموں میں صرف ہوتا تھا۔ ایک اور جگہ وہ لکھتی ہیں:

''مصروفیت میں میرے بچے ہیں، گھر ہے، ملازمت ہے اور سب سے بڑی مصروفیت میری ادبی زندگی ہے، میں اپنا وقت برباد نہیں کرتی اور کام کرتے رہنے میں یقین رکھتی ہوں''۔ ۹

ان کے اس بیان سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ ان کے شب و روز ادبی خدمت میں گذرتے ہیں۔

## شادی:۔

انسان کی زندگی میں شادی ایک خوشی کا دن ہوتا ہے۔ لیکن تقدیر نے شائستہ فاخری کے ساتھ بہت برا کیا۔ جو ایک حساس اور فنکار عورت کے ساتھ ایسا ہو گیا۔ شوہر زمانے کے ساتھ نہ ہوتا تو بہتر تھا۔ ان کی شادی ایک نامناسب

لڑکے ساتھ ہوگئی۔شوہر زمانے کے ساتھ ہوگیا اور شائستہ جیسی سلیقے مند بیوی کی قدر نہ کرسکا اس پر شوہر اور سسرال کا عذاب! شائستہ نے اس آگ کے دریا کو پار کیا۔اور اپنے آپ کو آزاد کیا۔ان کے دو بچے ہوئے اور دو سال کے بعد علاحدگی ہوگئی۔۱۰

شائستہ فاخری خود لکھتی ہیں:

> ''میری زندگی میں شادی کا رنگ پھیکا رہا، میں تنہا اپنے بچوں کی پرورش کر رہی ہوں۔زندگی کے سو کے سو فیصد رنگ کسی کا مقدر نہیں بنتے۔اگر ایک رنگ نہیں ہے تو ۹۹ تو ہیں۔میں شکر گزار ہوں اللہ کی اس نے مجھے بہت کچھ دیا، ایک رنگ حاصل نہ ہونے کا نہ کوئی گلہ ہے، نہ شکوہ، نہ کوئی ملال۔میں اور میری بڑی بیٹی آفرین زینت ،سی۔اے کی تیاری کر رہی ہے۔اور بیٹا بارھویں کا امتحان دے رہا ہے''۔۱۱

انہوں نے زندگی کے سارے غم، کڑوے تجربات اور گوناگوں حادثات کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔جس کی وجہ سے ایک حساس فن کار کی دنیا میں خلفشار تو اٹھا لیکن ان کی شائستگی یہ تھی کہ وہ چپ چاپ زندگی کے ستم کو سہتی رہیں۔وہ ایک بہادر عورت ہیں جس نے اپنی بہادری کو فن کاری میں بدل ڈالا۔

**ملازمت:۔**

شائستہ فاخری ۱۹۹۱ء سے ۱۹۹۴ء تک یعنی چار سال تک 'متر پرکاشن' الہ آباد کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والے ہندی رسالہ 'منورما' میں سب اڈیٹر رہیں۔انہیں صحافت کا تجربہ بھی حاصل ہے۔اس کے بعد ۱۹۹۶ء میں الہ آباد ہی سے آل انڈیا ریڈیو میں کام کرنا شروع کیا۔سپردستِ وہ سینیئر اناؤنسر آل انڈیا ریڈیو کی حیثیت سے ملازمت کر رہی ہیں۔

ادبی سفر:۔

شائستہ فاخری جب ساتویں جماعت میں تھیں تب انہوں نے ہندی میں 'آلنگن' کے عنوان سے ایک کہانی لکھی۔ جب والد کو پتا چلا تو انہوں نے پوچھا کہ آلنگن کیا ہوتا ہے، تو شائستہ نے جواب دیا 'گلے لگانا'۔ والد خاموش ہو گئے اور کہا اردو میں لکھنے کی کوشش کرو تا کہ ہم لوگ بھی سمجھ سکیں۔ لیکن شائستہ نے شعوری طور پر ہندی میں لکھنا چاہا۔ شائستہ نے یہ کہانی رومانٹک انداز میں لکھی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۸۰ کو ہندی میں ایک اور کہانی 'مانوشکتی کی وجے' کے عنوان سے لکھی۔ جو الہ آباد کے ہندی ساہتیہ سمیلن کے راشٹریہ بھاشا سندیش میں چھپی۔ کہانی کے چھپنے کے بعد روزانہ پسندیدگی کے پانچ سات خط بھی آنے لگے۔ اور انہیں اس کہانی پر اس وقت ۵۰ روپئے بطورِ معاوضہ بھی ملا تھا۔ اور انعام میں ایک لغت بھی۔[۱۲]

شائستہ فاخری کے ادبی سفر کا باقاعدہ آغاز ۱۹۸۰ سے ہندی زبان سے شروع ہوا۔ ۱۹۸۱ میں پہلا افسانوی مجموعہ 'سندی بیلا' ہندی زبان ہی میں شائع ہوا۔ سندی بیلا نے ہندی کہانی کاروں کے درمیاں انہیں کافی شہرت دلائی۔ اس مجموعہ سے اردو ادب کے لوگوں نے یہ بھی تسلیم کر لیا کہ یہ ایک ہندی رائٹر ہیں، مگر شائستہ کو وہاں ٹکے رہنا ممکن نہ تھا۔ کیونکہ ان کی مادری زبان کی کشش انہیں کھینچ رہی تھی۔ اردو ادب کی جاشنی انہیں اپنے سے دور نہیں جانے دے رہی تھی۔ جہاں تک 'سندی بیلا' کی شہرت کی بات ہے اس کے موضوعات مسلم معاشرے سے لئے گئے تھے اور تکنیک ہندی ادب سے کی تھی۔ اور پھر جو کہانیاں سامنے آئیں ان سے اس وقت کے تمام ہم عصر کہانی کاروں کے مقابلے میں ان کو ایک الگ پہچان ملی۔[۱۳]

جہاں تک اردو میں تخلیق کرنے کی بات ہے تو شائستہ کی مادری زبان اردو تھی لیکن پڑھا لکھا سنسکرت میں۔

چناں چہ وہ وقت بھی آیا جب مادری زبان نے انہیں اردو میں لکھنے پر مجبور کیا۔ پھر وقت گذرتا گیا۔ زندگی کی رفتار کبھی تیز تو کبھی دھیمی ہوتی رہی وہ اپنی سمت کا تعین کرتی رہیں اور ان کا قلم ان چڑھتے اترتے رنگوں سے صفحۂ قرطاس کو سیاہ کرتا رہا۔ دھیرے دھیرے ان کے افسانوی مجموعے ''ہرے زخم کی پہچان' اردو ادب میں ان کی شناخت قائم ہوئی۔ اس کتاب کے اشاعت کے بعد انھیں اردو دنیا میں آگے بڑھنے کا حوصلہ ملا۔ وہ لکھتی ہیں کہ لکھنا انکی مجبوری ہے۔ ان کا یہ بیان ملاحظہ کیجئے:

''ناول ہو یا افسانہ لکھنا میرا شوق ہی نہیں بلکہ لکھنا میری ضرورت ہے،لکھنا مجبوری ہے، نہ لکھوں تو ایک چیخ بن کر ہوا میں تحلیل ہو جاؤں گی ،بسترِ مرگ پر پڑے مریض کی آخری کراہ بن جاؤنگی۔اس لئے لکھتی ہوں۔ناول ہو یا افسانہ میرے اظہار کا ایک ایسا ذریعہ ہے جو مجھے راحت اور قلبی سکون مہیا کرتا ہے''۔[۱۴]

شائستہ فاخری کی تخلیقات ہندو پاک کے مختلف رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ ہندی کی تحریریں بیشتر رسائل جیسے 'منورما، نیا گیان اودے، ہنس اور سمکالین ساہیتہ میں چھپی۔اس کے علاوہ رچنا استور سالہ جوالہ آباد سے نکلتا تھا۔اور راشٹریہ بھاشا سندیش میں بھی چھپی۔اردو کے افسانے رسالہ 'تشکیل' (پاکستان)،ایوانِ اردو (دہلی)،سب رس (حیدرآباد)،شاعر (ممبئی)،شعروحکمت (حیدرآباد) چہارسو (پاکستان)،آج (پاکستان) وغیرہ میں ان کی تحریریں شائع ہوئی ہیں۔

شائستہ فاخری نے اردو فکشن کے علاوہ اردو شاعری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔لیکن اردو شاعری میں ان کا خاص میدان نظم نگاری ہے۔'اداس لمحوں کی خود کلامی' کے عنوان سے ایک نظم بھی لکھی ہے۔اور انکا ایک شعری مجموعہ 'کوئی موسم رہے جاناں' کے نام سے زیرِ طبع ہے۔شائستہ فاخری بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔انہوں نے افسانے کے علاوہ ناول، ڈرامے، شاعری اور کتابوں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔انہوں نے اردو ادب کے سرمایہ میں اپنی پیشِ قیمت تصانیف سے گراں قدر اضافے کئے ہیں۔ان کی تصانیف کی فہرست درجِ ذیل ہیں:

**افسانوی مجموعے:۔**

۱۔سندی بیلا (ہندی)

۲۔ہرے زخم کی پہچان (اردو اور ہندی)

۳۔دیہہ کا دکھ (ہندی)

۴۔اداس لمحوں کی خود کلامی (اردو)

ناول:۔

۱۔نادیدہ بہاروں نشاں (اردو)

۲۔صدائے عندلیب برشاخِ شب (اردو)

تراجم:۔

۱۔چوبیس زبانوں کی ہندوستانی کہانیاں (اردو)

۲۔انتم ارڑے نرمل ورما کی ناولکا اردو میں 'آخری بیاباں ' کے عنوان سے ترجم

ریڈیائی ڈرامہ:۔

۱۔حاشیہ پر لکھی تحریر

زیرِ طبع:۔

۱۔مجاز ویکتو اوم کرتتو

۲۔گوری سوئے سیج پر (ناول)

۳۔خشک پتوں کی موسیقی (افسانوی مجموعہ)

۴۔ایشیا کی منتخب کہانیاں (ترجمہ ہندی)

۵۔پاکستانی شاعرات: کلام کا انتخاب (ہندی)

۶۔بین الاقوامی کہانیوں کے تراجیم (ہندی)

## انعامات واعزازات:۔

۱۔ ۱۹۸۷ء پریاگ راج ٹائم کی جانب سے اعزاز

۲۔ ۱۹۹۶ء اتر پردیش اردو اکیدمی کی جانب سے کتاب 'ہرے ذخم کی پیچان پر انعام

۳۔ ۲۰۰۰ء میں ادبی کلچرل اور سماجی انجمن سمنوے کی جانب سے چیتنیا شری کا خطاب

۴۔ ۲۰۰۲ء اور ۲۰۰۳ء میں متر کل پریاگ کی جانب سے اعزاز

۵۔ ۲۰۱۳ء میں بہار اردو اکیدمی کی جانب سے 'اداس لمحوں کی خود کلامی' افسانوی مجموعہ پر شکیلہ اختر ایوارڈ

۶۔ ۲۰۱۳ء میں کلچرل اور سماجی انجمن رنگ وبتیکا کی جانب سے اعزاز

۷۔ ۲۰۱۴ء میں اتر پردیش اردو اکیدمی کی جانب سے افسانوی مجموعہ 'اداس لمحوں کی خود کلامی' پر انعام

۸۔ ۲۰۱۴ء میں ایٹاوا میں سارسوت سمّان

۹۔ ۲۰۱۵ء نادیدہ بہاروں کے نشاں ناول پر بہار اردو اکیدمی کی جانب سے صفحہ اول کا ایوارڈ دیا گیا۔

# شخصیت کے نقوش

## حلیہ:۔

شائستہ فاخری کی وضع قطع اور عکسِ جمیل کچھ اس طرح سے ہے: کتابی چہرہ، لمبی ناک، بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں، مناسب ہونٹ، گوری رنگت، لمبی اُنگلیاں، قدرمیانہ، سادے بال غرض نہایت خوبصورت وشکل کی مالک ہیں۔

## پسند ناپسند:۔

جہاں تک پسند اور ناپسند کی بات ہیں۔ وہ تنہائی پسند ہیں۔ اور ہمیشہ یہ کوشش کرتی ہیں کہ بھیڑ سے دور رہیں۔ انہیں اکیلے بیٹھ کر تخلیقی کام کرتے رہنا پسند ہے۔ علاوہ ازیں قدرتی مناظر کو دیکھنا اور ان میں اپنے آپ کو کھو دینا انہیں پسند ہے۔ وہ ایسے میں کسی کی دخل اندازی کو پسند نہیں کرتیں خواہ وہ ان کی اولاد ہی کیوں نہ ہو۔

جہاں تک کھانے پینے کی پسند کی بات ہے انہیں سادہ کھانے پسند ہیں۔ دودھ، دہی، پنیر، مرغ، ماہی کھانے کی شوقین ہیں۔ میٹھا دیکھ کر ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آجاتی ہے۔ اچھا لباس پہنا انہیں پسند ہے خواہ سادہ ہی کیوں نہ ہو۔ رنگوں میں میرون اور آسمانی، خوشبو میں رات کی رانی، پھول میں بیلا انہیں پسند ہے۔[۱۵]

شائستہ فاخری رسالہ شاعر میں اپنی پسند کی وضاحت کرتی ہوئی لکھتی ہیں:

> ''میں ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتی ہوں کہ اپنے بچوں کو ان کے پسند کے مطابق غذائیں تیار کروں، غذاؤں میں کم وبیش تمام کھانے بنالیتی ہوں''۔[۱۶]

## خوش گفتاری:۔

شائستہ فاخری بڑی خوش مزاج اور خوش اخلاق شخصیت کی مالک ہیں۔ وہ کم سے کم لوگوں سے بات کرتی ہیں، مگر پھر بھی وہ اپنی گفتگو کے دوران میں خلوص اور شائستگی کا اظہار کرتی ہیں۔ علی احمد فاطمی ان کے اندازِ گفتگو کی ستائش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اس کی گفتگو میں بلا کا اعتماد ہوتا ہے۔ جو کچھ لکھتی ہیں۔ جو کردار گڑھتی ہیں اس کے پیچھے با ضابطہ ایک سوچ ہوتی ہے، نظریہ ہوتا ہے اور گفتگو میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے منطقی انداز میں اس پر قائم بھی رہتی ہیں۔ ادھر ادھر کی بحثوں کی وہ پروانہ کرتیں۔ اس کی خاموشی میں بے چینی اور علاحدگی میں سنجیدگی پوشیدہ ہے۔ اس لیے وہ اندر ہی اندر فکر و خیال کے ایک طوفان میں مبتلا رہتی ہے جو تخلیق کار بن کر اس کے رگ و ریشہ میں دوڑتا ہے۔ جسے وہ سنبھال کر رکھنا چاہتی ہے''۔ ۱۷

علی احمد فاطمی نے ان کے بارے میں جو رائے قائم کی ہے وہ سو کے سو فیصد درست ہے۔

**مزاج:۔**

جہاں تک مزاج کا تعلق ہے، ان کے مزاج میں تلخی نہیں ہے۔ وہ خود رسالہ شاعر میں بتائی ہیں:

''میرے مزاج میں تلخی نہیں ہے ۔۔لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے غصہ نہیں آتا ۔انسانی فطرت میں سب کچھ شامل ہے۔ غصہ، احتجاج اور نرمیت۔۔۔ ظاہر ہے جب کوئی کسی کے ساتھ ناروا سلوک کرے تو خاموش رہنے والا مہا بے قوف ہی کہلائے گا۔ آج کی عہد میں جینے کے اپنا ہر انداز حالت کے مطابق رکھنا پڑتا ہے۔ اور گھر یا گھر سے باہر معاملات سے سمجھوتہ کرنے کے لئے حالات کی نزاکت کی حساب سے خود کو ڈھالنا پڑتا ہے۔ لیکن اگر مزاج میں نرمی خوشگواری اور لچیلا پن ہو تو لوگ خود بہ خود آپ کی عزت کرینگے۔ یہ میں نے محسوس کیا ہے اور اپنے تجربوں سے سیکھا ہے''۔ ۱۸

اس سے ان کے مثبت رویے کا پتہ چلتا ہے۔

**حلقۂ احباب:۔**

شائستہ فاخری کا حلقۂ احباب کافی محدود ہے۔ کیونکہ وہ بچپن ہی سے اپنے بھائی بہنوں سے الگ تھلگ رہا کرتی

تھیں۔آج بھی وہ اپنے آپ کو بھیڑ سے بچاتی ہیں۔وہ اپنے کو بھیڑ سے بچاتی تھیں۔وہ خود اپنے حلقۂ احباب کے تعلق سے لکھتی ہیں:

''میرا حلقۂ احباب مکمل طریقے سے ادبی دنیا سے جڑا ہوا ہے۔ مجھے خوشی بھی یہیں ملتی ہے۔میں اپنی دیگر زمہ داریوں کے بعد اپنا مکمل وقت ادب کو ہی دیتی ہوں۔یہ میری روحانی ضرورت ہے، میں زندہ رہ سکوں جہاں تک سماجی و فلاحی خدمات کی بات ہے اسے میں پوشیدہ رکھنا چاہتی ہوں''۔۱۹

شموئل احمد نے شائستہ فاخری کے تعلق سے اپنے تاثرات اس طرح پیش کئے ہیں:

''بہت خنجر ذہن کی خاتوں ہیں اور بہت ہی انداز قسم کی خاتوں ہیں۔ان کی شخصیت میں ایک اختتام ہے۔اصل یہ چیز ہے کہ آپ جس چیز پر یقین رکھتے ہیں، جس چیز کے مطابق زندگی گزارتی ہیں یہ ان کی شخصیت پر منتقل کرتی ہے۔یہ بات شائستہ فاخری میں ہے''۔۲۰

علی احمد فاطمی نے بھی شائستہ فاخری کے تعلق سے ان خیالات کا اظہار کیا ہے:

''شائستہ فاخری بہت ہی سنجیدہ بڑی خاموش طبیعت کی اور اندر ہی اندر سوچنے والی اور ایک طرح سے بغاوت کرنے والی ان کی شخصیت سے یہ پتہ چلتا ہے، وہ عمر پہلے سے ہی ایک مضبوط طریقے سے سوچنا شروع کر دیا''۔۲۱

## شہرت و نام و نمود سے دوری:۔

شائستہ فاخری شہرت و نام و نمود کو پسند نہیں کرتیں۔اکثر ان سے کوئی ادبی مقام و مرتبے کے تعلق سے سوال کرتا ہے تو 'کہتی ہیں میں ان شہرت کی بھوکی نہیں ہوں'۔وہ صرف لکھنا پسند کرتی ہیں۔وہ اپنے بارے میں خود کہتی ہیں:

''میں شہرت کی بھوکی نہیں ہوں۔لکھنے، پڑھنے پر یقین رکھتی ہوں۔میں وقتی یا عارضی ادب پرستی کی قائل نہیں ہوں۔میں تعریفوں سے بھی خوش نہیں ہوتی۔یہ تو انسانی فطرت ہے کہ

تعریفوں سے حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور آگے بڑھنے کے راستے آسان ہوجاتے ہیں، میں نے ہمیشہ خود کو متوازن رکھا ہے۔اور کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوتی ہوں۔اللہ پاک سے یہی دعا کرتی ہوں کہ اس سے زیادہ اچھا لکھ سکوں۔بس اسی قوت کی طلبگار رہوں جو مجھ سے اچھی تحریریں لکھوالے''۔۲۲

اس مطالعہ سے صاف معلوم یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک مسلم مذہبی گھرانے میں پیدا ہونے کے باوجود ان کے اندر اتنی جرٔت ہے کہ انھوں نے سنسکرت میں تعلیم حاصل کی۔اور ہندوؤں کی مذہبی تصانیف کا بغور مطالعہ کیا۔اس سے ان کی وسعتِ ذہنی کے علاوہ ان کے علمی پیاس کا اندازہ ہوتا ہے۔وہ ایک خاموش طبع اور باوقار خاتون ہیں۔جن کی ازدواجی زندگی ناکام ہونے کے باوجود وہ زندگی کی جنگ لڑتی رہیں۔یہ محض ان کی شخصیت کا کرشمہ ہے کہ وہ اس سوسائٹی میں سر اُٹھا کر چلتی ہیں۔

حوالہ:۔

۱ محمد نظام الدین، مضمون مشمولہ دائرہ شاہ اجمل، کتاب تاریخِ مشائخِ الہ آباد، سرسوتی آفسٹ، الہ آباد، ۱۹۱۹، ص۔۱۳۲ سے ۱۴۲

۲ افتخار امام صدیقی، مشمولہ شائستہ فاخری سے ادبی مکالمہ، رسالہ شاعر، ممبئی، مارچ ۲۰۱۲، ص۱۴

۳ سید ضمیر جعفری، مشمولہ ایک مختصر مکالمہ شائستہ فاخری، ماہنامہ چہارسو، جلد۲۴، شمارہ مئی۔ جون ۲۰۱۵، پاکستان، ص۱۱۔

۴ علی احمد فاطمی پروفیسر، مشمولہ ترے آسماں اور بھی ہیں، ماہنامہ چہارسو، جلد۲۴، شمارہ مئی۔ جون ۲۰۱۵، پاکستان، ص۲۱۔

۵ شائستہ فاخری ڈاکٹر، کتاب مشمولہ اداس لمحوں کی خود کلامی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۱، ص۲۱۔

۶ علی احمد فاطمی پروفیسر، مشمولہ ترے آسماں اور بھی ہیں، ماہنامہ چہارسو، جلد۲۴، شمارہ مئی۔ جون ۲۰۱۵، پاکستان، ص۲۱۔

۷ سید ضمیر جعفری، مشمولہ ایک مختصر مکالمہ شائستہ فاخری، ماہنامہ چہارسو، جلد۲۴، شمارہ مئی۔ جون ۲۰۱۵، پاکستان، ص۱۲۔

۸ افتخار امام صدیقی، مشمولہ شائستہ فاخری سے ادبی مکالمہ، رسالہ شاعر، ممبئی، مارچ ۲۰۱۲، ص۱۹۔

۹ شائستہ فاخری ڈاکٹر، مشمولہ سوال نامہ۔

۱۰ علی احمد فاطمی پروفیسر، مشمولہ ترے آسماں اور بھی ہیں، ماہنامہ چہارسو، جلد۲۴، شمارہ مئی۔ جون ۲۰۱۵، پاکستان، ص۲۳۔

۱۱ سید ضمیر جعفری، مشمولہ ایک مختصر مکالمہ شائستہ فاخری، ماہنامہ چہارسو، جلد۲۴، شمارہ مئی۔ جون ۲۰۱۵، پاکستان، ص۱۴۔

۱۲ افتخار امام صدیقی، مشمولہ شائستہ فاخری سے ادبی مکالمہ، رسالہ شاعر، ممبئی، مارچ ۲۰۱۲، ص۱۵۔

۱۳ سید ضمیر جعفری، مشمولہ ایک مختصر مکالمہ شائستہ فاخری، ماہنامہ چہارسو، جلد۲۴، شمارہ مئی۔ جون ۲۰۱۵، پاکستان، ص۱۴۔

۱۴ شائستہ فاخری ڈاکٹر، مشمولہ سوال نامہ۔

۱۵ ایضاً

۱۶ افتخار امام صدیقی، مشمولہ شائستہ فاخری سے ادبی مکالمہ، رسالہ شاعر، ممبئی، مارچ ۲۰۱۲، ص۲۰۔

۱۷ علی احمد فاطمی پروفیسر، مشمولہ ترے آسماں اور بھی ہیں، ماہنامہ چہارسو، جلد۲۴، شمارہ مئی۔ جون ۲۰۱۵، پاکستان، ص۲۲۔

۱۸؎افتخار امام صدیقی، مشمولہ شائستہ فاخری سے ادبی مکالمہ، رسالہ شاعر، ممبئی، مارچ ۲۰۱۲، ص ۲۰۔

۱۹؎شائستہ فاخری ڈاکٹر، مشمولہ سوال نامہ۔

۲۰؎شموئل احمد، انٹرویو ۳۱/۰۳/۲۰۱۵، وقت pm ۴:۰۰ ۔

۲۱؎علی احمد فاطمی پروفیسر۔ نٹرویو، ۰۸/۰۳/۲۰۱۵ وقت pm ۹:۱۵ ۔

۲۲؎افتخار امام صدیقی، مشمولہ شائستہ فاخری سے ادبی مکالمہ، رسالہ شاعر، ممبئی، مارچ ۲۰۱۲، ص ۲۰۔

# دوسرا باب:۔شائستہ فاخری کی ادبی خدمات کا اجمالی جائزہ

اردو شعر و ادب میں مختلف خواتین تخلیق کاروں نے مختلف اصناف نظم و نثر میں طبع آزمائی کر کے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا ہے۔ جیسے رشید النساء سے لے کر آج تک کی خواتین تخلیق کاروں نے اردو فکشن میں اپنے ماحول اور حالات کے مطابق عورتوں کے مسائل سے متعلق مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ تاہم عورتوں کے مسائل میں کوئی کمی نہیں آئی ہے، بلکہ مسائل اور بڑھ گئے ہیں۔ کہنے کو تو عورت ازل سے ابد تک عورت ہی ہوتی ہے لیکن وہی عورت کئی روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ کبھی بیٹی تو کبھی ماں، کبھی بہن تو کبھی بہو، اور بیوی وغیرہ۔ جب عورت کے اتنے روپ ہیں تو اس کے مسائل و ضروریات بھی مختلف ہی ہوں گے۔ جیسے تعلیم، پردہ، سوتیلی ماؤں کی بدسلوکی، ساس نندوں کے مظالم، شوہروں کا دوسری عورتوں کے ساتھ رشتہ غیرہ۔ آج بھی عورت ہندوستانی معاشرے میں ان حالات سے دوچار ہے۔

ناول کا آغاز انیسویں صدی میں ہوا تو اس وقت عورت کی زندگی چہار دیواروں تک محدود تھی۔ اس کی وجہ سے ان کی سوچ بھی محدود تھی۔ لیکن عصر حاضر کی عورت نے مردوں کے ماحول میں رہتے ہوئے اپنی ایک الگ پہچان بنائی ہے۔ ایسی بہت سی خواتین ہیں جنھوں نے اردو ادب میں ایک اعلیٰ مقام حاصل کر لیا ہے۔ اور جن کے بغیر اردو ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ ان نامور خواتین میں قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور، رشید جہاں، جمیلہ ہاشمی، جیلانی بانو وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ موجودہ دور کے خواتین افسانہ نگاروں میں ذکیہ مشہدی، ترنم ریاض، قمر جہاں، نواب سحر، رینو بہل، جیسی معتبر و معروف شخصیات کا نام لیا جا سکتا ہے۔ جن کی تخلیقات میں عورت کے مسائل واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ ان ہی نامور خواتین میں ایک نام شائستہ فاخری کا بھی ہے۔ جو ادبی دنیا میں قابلِ احترام ہستی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انھوں نے اردو کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ افسانہ، ناول، ڈرامہ، تراجم، اور شاعری وغیرہ۔ اردو کے علاوہ وہ ہندی کی بھی فکشن نگار ہیں۔

شائستہ فاخری اردو میں لکھے یا ہندی میں انکا خاص میدان افسانہ نگاری ہے۔ وہ کسی بھی واقعے کا مشاہدہ بڑی باریک بینی کے ساتھ کرتی ہیں۔ اور اس کا ایک نیا روپ پیش کر کے قاری کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں۔ ان کی

تخلیقات میں نسوانی مسائل کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔

شائستہ فاخری کی ادبی خدمات کا جائزلینے سے پہلے میں ان کے تخلیقی شعور، سوچنے اور سننے کے عمل کا ذکر کرنا چاہوں گی۔انھوں نے یوں ہی اپنا قلم نہیں اٹھایا ہے بلکہ اپنے آس پاس کے ماحول اور عورتوں کے مسائل کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے، سننے اور ان پر غور وفکر کرنے کے بعد انھیں کہانیوں کا روپ دیا ہے۔

وہ اپنے اندر کی تخلیقی اکھوے پھوٹنے کی وجہ بتاتی ہوئی کہتی ہیں:

''جب میں چھوٹی تھی تب بزرگوں کی باتوں پر پورا دھیان دیتی تھی۔ان کی نیک سیرت باتیں سن سن کر میرے دل میں بھی ایسے کلمات کہنے اور لکھنے کا ذوق پیدا ہوا۔پھر جب بڑی ہوئی تو پاس پڑوس کی عورتیں میرے گھر یا خانقاہ آیا کرتی تھیں۔اور وہ اپنے دکھڑے سنایا کرتی تھیں۔ان عورتوں میں کنواری، شادی شدہ اور عمرِ دراز سب ہوتی تھیں سب کے حالات وہ واقعات، سب کے المیہ اور سانحات الگ الگ قسم کے ہوتے تھے۔میں ان عورتوں کی باتوں سے اپنے اندر ایک حل چل محسوس کرتی اپنے اندروں میں جھانکتی اور ان وقوعات پر غور کرتی، ان کے تانے بانے بنتی اور پھر اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتی۔ظاہر ہے جب اپنے آس پاس لکھنے اور اظہار کرنے کے لیے بہت کچھ موجود ہو تو پھر قلم پر قابو کیوں کر پایا جا سکتا تھا۔میں نے مختصر افسانوں کی طرح ان چیزوں کو آڑے ترچھے لکھنا شروع کر دیا۔لیکن چھپنے چھپانے کی خواہش نہ تھی۔ چوں کہ میرے والدِ محترم کا ادبی ذوق صاف ستھرا تھا۔اور ان حلقۂ احباب میں شہر کی مقتدر اور قابلِ عزت شخصیات تھیں۔اس لیے مجھے تحریک ملی۔جب انہیں اندازہ ہوا کہ میں افسانہ لکھنے یا شاعری کرنے کی طرف مائل ہوں تو انہوں نے میری حوصلہ افزائی کی۔ان کے دلجوئی

سے مجھے احساس ہوا کہ میرے اندر تخلیقی صلاحیت ہے اور میں لکھ سکتی ہوں''۔ [۱]

ان کے اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کے ان کا تخلیقی سفر کا آغاز کتنی سنجیدگی سے ہوا اور دھیرے دھیرے ان کا سفر بڑھتا رہا۔اب وہ ایک معروف فکشن نگار کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں۔

ذیل میں شائستہ فاخری کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف کا ذکر کیا جاتا ہے۔سب سے پہلے افسانوی مجموعے ہیں۔

۱۔سندی بیلا (ہندی)

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۲۔ہرے زخم کی پہچان (اردو اور ہندی) | اتر پردیش، | لکھنؤ، | ۱۹۹۲ء |
| ۳۔دیہہ کا دکھ (ہندی) | بھارتی پریشد پریاگ، | الہ آباد | |
| ۴۔اداس لمحوں کی خود کلامی (اردو) | پہچان پبلیکیشنز، | الہ آباد | ۲۰۱۰ء |

ناول:۔

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۔نادیدہ بہاروں کے نشاں (اردو) | ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، | دہلی | ۲۰۱۳ء |
| ۲۔صدائے عندلیب برشاخِ شب (اردو) | ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، | دہلی | ۲۰۱۴ء |

تراجم:۔

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۔چوبیس زبانوں کی ہندوستانی کہانیاں (اردو) | عرشیہ پبلیکیشنز | دہلی | ۲۰۱۲ء |

۲۔انتم ارڑے نرمل ورما کی ناول کا اردو میں 'آخری بیاباں' کے عنوان سے تراجم 'آج' پاکستان کے ادبی کتابی سلسلے میں شمارہ ۷۵ میں شائع۔

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۔حاشیہ پر لکھی تحریر (ریڈیائی ڈرامہ) | قومی اردو کونسل | نئی دہلی | ۲۰۱۵ء |

زیرِ طبع:۔

۱۔مجاز ویکتو اوم کرتتو

۲۔گوری سوے سیج پہ (ناول)

۳۔خشک پتوں کی موسیقی (افسانوی مجموعہ)

۴۔ایشیا کی منتخب کہانیاں (ترجمہ ہندی)

۵۔پاکستانی شاعرات: کلام کا انتخاب (ہندی)

۶۔بین الاقوامی کہانیوں کے تراجم (ہندی)

شائستہ فاخری نے سب سے پہلے 'آلنگن' کے عنوان سے ایک کہانی لکھی۔اس کے بعد وہ مسلسل کئی کہانیاں ہندی ہی میں لکھتی رہیں۔حیرت کی بات ہے کہ یہ کہانیاں انھوں نے انٹرمیڈیٹ کے دوران میں لکھی تھی۔یہ تمام کہانیاں ایک مجموعے کی شکل میں 'سندی بیلا' میں شامل ہیں جو ۱۹۸۱ میں انٹرمیڈیٹ کی تعلیم پوری ہونے کے فوراً بعد چھپا تھا۔ان کہانیوں میں شائستہ فاخری کا اسلوب ہندی اور سنسکرت ادبیات سے قریب ہے۔علی احمد فاطمی نے شائستہ فاخری کی ہندی میں تخلیق کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''شائستہ فاخری نے ارادی اور شعوری طور پر ہندی میں لکھنا چاہا تا کہ اس کی بات دور تک پہنچے اور فرسودہ اردو والوں کو زیادہ خبر بھی نہ ہو۔اور وہ اسی بوسیدہ روایت و فرسودگی کی کائی کو توڑنا چاہتی تھی۔اس لیے سرکشی اور سمجھداری اسے ہندی کی طرف لے گئی۔انٹرمیڈیٹ تک پہنچتے پہنچتے اس نے کئی کہانیاں ہندی میں لکھیں۔جن میں 'سندی بیلا' کو شہرت ملی اور وہ ہندی والوں میں جانے پہچانے لگی۔اردو والے بے خبر''۔ ۲

علی احمد فاطمی کے ان جملوں سے پتہ چلتا ہے کہ شائستہ فاخری کا شعور ہندی میں بیدار ہوا۔اور وہ اردو والوں سے دور ہندی کی طرف گامزن ہوئیں۔

شائستہ فاخری اپنا پہلا ہندی افسانوی مجموعہ 'سندی بیلا' کے تعلق سے کہتی ہیں:

> ''یہ سچ ہے کہ ۱۹۸۱ میں 'سندی بیلا' نے ہندی کہانی کاروں کے درمیان مجھے کافی شہرت دلائی بلکہ اسی مجموعہ سے اردو ادب کے لوگوں نے بھی یہ تسلیم کرلیا کہ میں ایک ہندی رائٹر

ہوں، میرا مستقبل ہندی ادب میں ہی پروان چڑھے گا۔ میرے لیے وہاں ٹکے رہنا ممکن نہیں تھا۔ کیوں کہ مادری زبان کی کشش مجھے کھینچ رہی تھی۔ جہاں تک 'سندی بیلا' کی شہرت کی بات ہے میں نے اس کے موضوعات مسلم معاشرے سے لیا۔ اور تکنیک ہندی ادب سے کھینچی۔ پھر جو کہانیاں سامنے آئی وہ اس وقت کی تمام ہم عصر کہانیاں لکھنے والوں میں ایک الگ پہچان دیے گئے''۔[۳]

شائستہ فاخری کے اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے تو کہانیاں ہندی میں لکھیں، اور انھیں شہرت بھی ملی۔ مگر وہ اپنی مادری زبان کے لیے اندر سے بے چین تھیں۔

شائستہ فاخری کا پہلا افسانہ 'آلنگن' ہے، جو اس مجموعہ میں شامل ہے۔ آلنگن کے معنے ہیں ایک دوسرے کی باہوں کی گرفت میں آ جانا۔ یہ ایک رومانی کہانی ہے۔ کہانی کا پلاٹ کچھ اس طرح ہے کہ ایک گاؤں، جہاں کھلے عام محبت کے اظہار پر سخت پابندی ہوتی ہے، وہاں ایک غریب لڑکا پردھان کی بیٹی سے محبت کر بیٹھتا ہے۔ ان دونوں کی محبت کو دیکھ کر پردھان اس کو قتل کروا دیتا ہے، اور خبر یہ اُڑا دیتا ہے کہ لڑکے کی موت کی وجہ ہندو مسلم فساد ہے۔ خبر گاؤں میں پھیل جاتی ہے۔ لڑکی کو برداشت نہیں ہوتا وہ بھی کوئیں میں کود کر اپنی جان دے دیتی ہے۔ یوں آسمان پر دونوں روحوں کا آلنگن ہوتا ہے۔ زمیں پر جو ممکن نہ ہو سکا تھا۔ اسے آسمان کی وسعتیں پورا کر دکھاتی ہیں۔

مہادیوی ورما نے شائستہ فاخری کی تخلیق سندی بیلا کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے:

''سندی بیلا میں انہوں نے فطرت کی رنگا رنگی علامتی انداز میں زندگی کے حساس موضوعات کو اس ڈھنگ سے پیش کیا ہے جو کہیں کہانی اور کہیں نثری نظم کے دھوپ چھاؤں کے تانے بانے سے بنے جان پڑتے ہیں۔ زندگی کے تئیں کماری شائستہ کی تیز روی ان کی حساس طبیعت سے پوری طور پر آشکارا ہے۔ جو ہر ایک تخلیقی عمل کا لازمی حصہ ہے''۔[۴]

اپندر ناتھ اشک نے بھی اس مجموعہ پر اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے:۔

''سندی بیلا کی کہانیاں پڑھتے ہوئے ایک بہت ہی حساس اور جذبات سے لبریز فکری ذہنیت کا پتہ چلتا ہے۔تخلیق کار پر چھوٹے چھوٹے حادثوں کا گہرا اثر ہوتا ہے۔وہ اسے مضطرب کر جاتے ہیں،اور وہ خیالوں کی صف بندی کر کے انہیں کہانیوں میں پرو دیتی ہیں''۔۵

ان کی کہانیوں میں جدت کی رنگارنگی پائی جاتی ہے،زندگی کی حقیقتوں کو علامتی انداز میں پیش کرنے کا رجحان ملتا ہے۔یہی وجہ ہے قاری ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اس کتاب کی اشاعت کے بعد انہوں نے اردو میں کہانیاں لکھنا شروع کیں۔اردو کہانیوں کا ایک مجموعہ'' ہرے زخم کی پہچان''۱۹۹۲ میں منظرِ عام پر آیا۔اس مجموعہ میں تیرہ افسانے ہیں۔جن میں ہرے زخم کی پہچان،زخمی احساس، ایک نیا جانور،ریچھ،خالی گھونسلا وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔شائستہ فاخری نے مجموعے کے شروع میں 'میرا قلم' کے عنوان سے یوں لکھا ہے:

''میرا افسانوں کا یہ مجموعہ 'ہرے زخم کی پہچان' کے عنوان سے شائع ہو رہا ہے۔اس میں زہر کے ننھے ننھے قطرے مختلف عنوان سے افسانوں کی شکل میں بکھرے ہوئے ہیں۔مجھے علم نہیں کہ یہ قطرے لمحہ لمحہ شہید ہونے والے فن کاروں کی صف میں مجھے کھڑا کر کے شہادت کا درجہ دلانے میں کامیاب ہوں گے یا نہیں''۔ ۶

شائستہ فاخری کے اس بیان سے ان کے تخلیقی کرب کا اندازہ ہوتا ہے۔

آصفہ زمانی نے 'ہرے زخم کی پہچان کہانیوں پر اپنے تاثرات اس طرح پیش کیے ہیں:

''شائستہ فاخری کا نام موجودہ افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام ہے۔کیونکہ انہیں زندگی میں بکھرے ہوئے واقعات کو سلیقے سے سمیٹ نے کا ہنر آتا ہے۔یہی وجہ

ہے کہ ان کے بعض افسانے دل کو چھو جاتے ہیں مثلاً کہانی 'ایک جانور' میں انہوں نے اشرف المخلوقات کہے جانے والے انسان کو جس طرح جانوروں کی زبانی بے نقاب کیا ہے۔ یا افسانہ 'ریچھ' میں انہوں نے مرد کی ہوس نا کی کو اشاروں اشاروں میں جس نفسیاتی طریقے سے پیش کیا ہے۔ 'خالی گھونسلا' جس خوبصورتی سے ایک مالدار عورت کی بے بسی کی داستان سناتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ شائستہ فاخری کہانی کہنے کا ہنر خوب جانتی ہیں۔ کہانی وہی کامیاب کہلاتی ہے۔ جب کلائمکس میں پہنچ کر قاری کو ایک دھچکے کا احساس ہو۔ اس مجموعہ میں شامل کہانیاں اسی معیار پر اترتی ہیں۔ اگر وہ اسی طرح لکھتی رہیں تو ان کا قلم اور رواں ہوگا۔ ایسی مجھے امید ہے''۔ ے

'ہرے زخم کی پہچان' کی اشاعت کے بعد بھی وہ ہندی میں کہانیاں لکھتی رہیں۔ ہندی افسانوں کا دوسرا مجموعہ 'دیہہ کا دکھ' کے نام سے شائع ہوا۔ جس مجموعہ میں آٹھ افسانے شامل ہیں جو درجِ ذیل ہیں: صنم بت ٹوٹ گیا، دیہہ کا دکھ، زخمی احساس، ریچھ، ہنگر پر لٹکی زندگی، خالی گھونسلا، ہری دھوپ پر پیلا پتہ، اکیسویں صدی کا بچہ وغیرہ۔

'ہرے زخم کی پہچان' میں شامل تین افسانے زخمی احساس، ریچھ، خالی گھونسلا ہندی میں ترجمہ کئے گئے ہیں۔ جو ''دیہہ کا دکھ'' میں شامل ہیں۔ جو یہ ہیں: زخمی احساس، ریچھ، خالی گھونسلا۔

شائستہ فاخری ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں ساتھ ساتھ لکھتی رہیں۔ حال ہی میں انہوں نے ہرے زخم کی پہچان کے نام سے ہندی میں ایک افسانوی مجموعہ شائع کروایا ہے، جو دراصل اردو کہانیوں کا ہندی روپ ہے۔

اداس لمحوں کی خود کلامی ان کا ایک اور مجموعہ ہے جس میں شامل افسانوں میں: سنور قیہ باجی، آفندی کا بیٹا، کنور فتح علی، اداس لمحوں کی خود کلامی، صوفی آپا، چل گوئیاں سنگ بیٹھیں، آخری پہر کا ڈوبتا ہوا منظر، منگلا کی واپسی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اس مجموعے میں شامل افسانے مختلف موضوعات پر لکھے گئے ہیں۔ اور ایک ہی موضوع پر لکھے گئے کئی افسانے بھی

ہیں۔جیسے آفندی کا بیٹا،سرخاب ابھی زندہ ہے،کلر بلائنڈ،آزادقیدی وغیرہ ایک ہی موضوع پر لکھے گئے افسانے ہیں۔جن کا موضوع فساداوردہشت گردی ہے۔اسی طرح ان کے دوافسانے آخری پہر کا ڈوبتا ہوا منظر،چل گوئیاں سنگ بیٹھیں جیسی کہانیاں بوڑھی نسل کا المیہ پیش کرتی ہیں۔ایک اورافسانہ منگلا کی واپسی ہے جوآج کے سیاسی داؤ پیچ اورفریب کاریوں پر بھر پورطنز ہے۔اس کے علاوہ اداس لمحوں کی خودکلامی،کنور فتح علی،ریچھ جیسے افسانے ہمارے معاشرے کے تلخ حقائق کوسامنے لاتے ہیں اورخوفِ گنبد میں روشن آنکھیں،حرف حرف حساب کا دن،صوفی آپا جیسے افسانے تصوف اورخوف سے جڑے ہوئے خواب جیسے موضوعات پر لکھے گئے ہیں۔جو ہمارے لیے بہت اہم ہیں۔

پروفیسر گوپی چندنارنگ نے شائستہ فاخری کے افسانوں کواوران کے موضوعات کوسراہتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''شائستہ فاخری نے زندگی کے سچ کواتنے مختلف النوع جہتوں سے پیش کیا ہے کہ یقین نہیں ہوتا ہمارے معاشرے کا سچ کتنی ملاوٹوں کے ساتھ برسرپیکار ہے۔اس سچ کا تعلق ہر طبقے سے وابستہ افراد کے انفرادی، اجتماعی اورمعاشرتی رویوں اور مسئلوں سے ہے۔یہ افرادمرد بھی ہیں۔اورعورت بھی۔لیکن عورت ان کے یہاں حاوی کردار یا موضوع بنکر سامنے آئی ہے۔عورتوں کواندرونِ خانہ اور بیرونِ خانہ کس طرح کی صورت حالات،کن کن داخلی اورخارجی مسئلوں پدری نظام میں کن کن پرخطر راستوں اور کیسے کیسے پیش یا افتادہ رویوں سے گزرنا پڑتا ہے۔یہ ان کے افسانوں کے خصوصی موضوعات ہیں۔ان کے افسانوں میں عورت کی بیچارگی اورمجبوری کے ساتھ ساتھ بیداری اورآزادیٔ نسواں کی بھی آوازیں ملتی ہیں''۔۸

پروفیسرنارنگ کا یہ بیان شائستہ فاخری کے فن کا مکمل احاطہ کرتا ہے۔

''سنورقیہ باجی''ان کا ایک ایسا افسانہ ہے جوتحریکِ تانیثیت کی مسلم خاتونِ اول رقیہ سخاوت حسین کے نام منسوب ہے۔رقیہ سخاوت حسین نے اپنا افسانہ'sultana's dream'۱۹۰۵ میں لکھا تھا۔اس کے تناظر میں شائستہ

نے یہ بتانا چاہا کہ کیا ایک سو پانچ برسوں کے بعد بھی عورت کے مسائل، زندگی کی نا آسودگیاں وہی رہیں گی جو پہلے تھیں۔ کیا اس معاشرے میں عورت کا مقام جوں کا توں رہے گا؟۔ کبھی اسے آزدی نہیں ملے گی؟۔ ان تمام مسائل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے شائستہ فاخری نے سنورقیہ باجی جیسا افسانہ ہماری نذر کیا۔

رقیہ سخاوت حسین نے ایک صدی پہلے خواتین میں بیداری پیدا کرنے کی تحریک چلائی تھی۔ اس تحریک سے متاثر ہوکر کہانی کی واحد متکلم راوی اپنی آنکھوں میں آزادی اور خوشگوار زندگی کے خواب سجائے۔ اب وہ خواب دیکھتی ہیں کہ اسے بتائے بغیر اس کا جرم کیا ہے اسے بندی خانہ میں ڈال دیا جاتا ہے۔ وہ بھوک ہڑتال کرتی ہے، اس کہانی میں 'میڈم سارا کیچی' ایک ظالم عورت ہے جو اس پر بے انتہا ظلم کرتی ہے۔ میڈم سارا کیچی کے یہ دل سوز جملے ملاحظہ کیجئے۔

''اٹھ کمبخت۔ کھانا کھا، نخرے مت کھا، مرمرا گئی تو تیری لاش کو کہاں ٹھکانے لگائیں گے''

''کھانا کھاتی ہے یا پھر بلاؤں دو چار مردوں کو، منٹ بھر میں وہ سب تیری کس بل نکال دیں گے''

''مرتو یہیں اس زمین پر گڈھا کھود کر دفن کردوں گی تجھے۔ کتیا کہیں کی عورت کی ذات ہے، یا شیطان کی اولاد۔ دو دن سے مار کھا رہی ہے مگر ٹوٹی نہیں''۔[۹]

اس افسانے میں اس مظلوم عورت پر سلطانہ کے خواب چرانے کا الزام لگایا گیا ہے۔ اور جو مجرم کی طرح لاکپ میں پڑی ہوئی ہے۔ جب وہاں کا ایک اعلیٰ افسر اس کی ہڑتال ختم کروانے کیلئے آتا ہے تو وہ یہ شرط رکھتی ہے کہ اسے بتایا جائے کہ اس کا جرم کیا ہے۔

اس افسانے میں جگہ جگہ عورت پر ہونے والے بے جا ظلم وستم، کا پردہ فاش کیا گیا ہے۔ یہ چند جملے ملاحظہ کیجئے:

''کیا آپ کے یہاں کا انتظام یہی ہے کہ ایک عورت کو عورت کے ہی ہاتوں بے رحمی کی شکار بنادی'' دیکھئے میرا جسم دیکھئے، یہ سارے زخم سارے نشانات ایک عورت نے ہی میرے جسم پر ابھارے ہیں۔ کیا آپ انکار کرسکتے ہیں کہ یہ سب آپ کے اشارے پر نہیں ہوا۔ جو ظلم اس عورت نے مجھ پر کیا ہے اس سے آپ کیا

لاعلم ہیں۔آپ کے نظام کا یہ کونسا کھیل ہے جس میں کھلاڑی کوئی اور ہوتا ہے، مداری کوئی اور بنتا ہے۔اور شکار کس کے ہاتھوں مارا جاتا ہے، یہ پتہ ہی نہیں چلتا''۔[۱۰]

اس افسانے میں سب سے اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ سلطانہ کون ہے۔اور اس کا خواب کیا ہے؟ یہی وہ سوال ہے جس کا جواب شائستہ فاخری نے صاف جملوں میں تو نہیں دیا لیکن افسانے کی پوری فضا میں اسے پس منظر کے طور پر استعمال کیا ہے۔جب وہ جیل سے گھر جاتی ہے تو شوہر کی زیادتیاں سہتی ہے۔احتجاج کرنے پر شوہر اسے مار پیٹ کر گھر سے نکال دیتا ہے۔یہ چند جملے ملاحظہ ہوں

''کل جیل کی سلاخیں تھیں آج گھر کی سلاخیں ہیں۔فرق اتنا ہے کہ جیل کی سلاخوں میں جسم تار تار ہوتا ہے۔اور گھر کی سلاخوں میں ذہن تار تار ہوتا ہے۔سلاخیں بدل جانے سے تقدیر نہیں بدلا کرتی''۔ ''رقیہ باجی عورت کے وجود کی چیخ وکراہ اس کی روح کے المیے اس کے باطن کی ویرانی کو محسوس کرنے والا کون ہے۔سو برس کے بعد بھی ہے کوئی؟'' وہ رقیہ باجی سے مخاطب ہو کر کہتی ہیں، اب وہ خواب نہیں دیکھے گی، حقیقت کی دنیا میں زندگی بسر کرے گی''۔[۱۱]

شائستہ فاخری نے رقیہ سخاوت حسین سے متاثر ہو کر یہ افسانہ لکھا تھا۔وہ لکھتی ہیں:

''رقیہ سخاوت حسین کے اسم کو میں صرف ایک قلم کار کے نام سے ہی نہیں جوڑتی بلکہ عورت کے تئیں ایک کھلی سوچ رکھنے والی اس تحریک کو بھی ان سے جوڑتی ہوں۔جس نے عورت کی کھلی پتھرائی آنکھوں میں خوابوں کا کاجل لگا۔ایک سپناد کھا کر یہ سمجھایا کے جینے کا حق ہم عورتوں کو بھی ہے۔'' [۱۲]

شائستہ فاخری نے یہ افسانہ تمثیلی انداز میں پیش کیا ہے۔اس میں عورتوں کے مسائل،اور معاشرے میں ان کی زندگی پر مرتب ہونے والے اثرات کو موضوع بنایا ہے۔معاشرے میں عورت کو اتنی آزادی بھی حاصل نہیں کہ وہ اپنی مرضی سے زندگی بسر کرنے کا خواب دیکھ سکیں۔عورت کی یہی مجبوری بے بس ہو کر ہی ان کے افسانوں میں نظر آتی ہے۔

اس مجموعہ میں چند اور کہانیاں حرف حرف حساب کا دن،خوفِ گنبد میں روشن آنکھیں وغیرہ۔خواب کی تکنیک میں لکھی گئی ہیں۔خوفِ گنبد میں روشن آنکھیں' خوفِ الہیٰ پر مشتمل افسانہ ہے۔اس افسانے میں عورت کو مرکزیت حاصل ہے۔یہ ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جس نے اپنی جوانی میں گناہ کئے تھے،اور اس گناہ کا بوجھ اس کی زندگی میں تادم آخر رہتا ہے۔اس کی الجھنوں کو سلجھانے کے لئے ایک درویش اپنی صوفیانہ باتوں کے ذریعہ اس عورت کے مسائل کو حل کرنے کی سعی کرتا ہے۔درویش کی باتوں سے وہ عورت متاثر ہو جاتی ہے۔درویش عورت کو پرندے میں تبدیل کر دیتا ہے۔اس افسانے میں 'الف' پر زور دیا جاتا ہے۔کیونکہ افسانے میں الف کا استعمال اللہ تعالی کی وحدانیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔وہ عورت دراصل یہاں علامت کے طور پر آئی ہے۔اصل میں افسانہ نگار کے بقول وہ اپنا ضمیر ہے۔اور اپنے اندر کا نور ہے۔جس سے روحانیت،وحدانیت میں تبدیل ہوتی ہے۔افسانہ خوفِ گنبد میں روشن آنکھیں میں خوف 'خوف الٰہی' ہے۔اور روشن آنکھیں یعنی اپنے اندر کی روشنی ہے۔کیونکہ انسان اندھیرے سے اجالے کی طرف سفر کرتا ہے۔افسانہ ذکرِ الٰہی اور خوفِ الٰہی کے خوف سے روشن اور تابناک ہے۔جس سے تصوف کی کرنیں منکشف ہوتی ہیں۔

شائستہ فاخری کا افسانہ اداس لمحوں کی خود کلامی میں اعلیٰ فنکاری کی ساتھ ہم جنسیت کے موضوع کو پیش کیا ہے۔کہانی کے واقعات اس قدر گتھے ہوئے ہیں کے کسی بھی واقعے کو خارج نہیں کیا جا سکتا۔زینی کی ماں اور باپ دونوں نوکری کرنے کی چکر میں بچی کی دیکھ بھال کا خیال نہیں کرتے تھے۔اسلئے زینی کو نانی کے گھر بھیج دیتے ہیں۔ماں عیسائی تھی شادی کے بعد مسلمان ہوگئی تھی۔نانی کے گھر میں آزادی کا ماحول تھا جو زینی کیلئے ناگوار تھا۔کچھ دنوں بعد ایک خانگی فرم میں نوکری مل گئی تو اس کے والد نے اسے مومنہ ورکنگ ہاسٹل میں شریک کرا دیا۔اس کے کمرے کے نصف میں روبینہ علی نام کی ایک خاتون اسی ادارے کے کالج میں پڑھاتی تھی۔زینی نے اپنا سامان ترتیب دینے کے لیے نکالا تو اس میں ایک پنک

پینتھر تھا۔ جو اسے نانی نے اس کے لیے خریدا تھا۔ وہ ہمیشہ اس کو ساتھ لے کر سوتی۔ روبینہ علی بھی پینتھر سے دلچسپی لینے لگی۔ ایسے ہی رفتہ رفتہ بات پوری ہاسٹل میں پھیل گئی۔ اور زینی کو یہ کہہ کر ہاسٹل سے نکال دیا گیا کہ اس کی ماں عیسائی تھی۔ تب زینی نے الگ سے مکان خریدا۔ اور وہ چاہتی تھی کہ روبینہ علی بھی اس کے ساتھ گھر منتقل ہو جائے۔ لیکن یہاں افسوس کی بات یہ ہے کہ جیسے ہی زینی ہاسٹل پہنچی کہ پتہ چلتا ہے روبینہ علی کا انتقال ہو گیا۔ زینی نے فاتحہ پڑھنے کے لیے گارڈ کے ساتھ قبرستان گئی۔ وہاں بے ساختہ اسکے منہ سے نکلا۔ ''کیسی ہو روبینہ؟''

روبینہ اب میں کسی ہاسٹل میں نہیں رہتی۔ میں نے اپنا گھر خرید لیا۔ میں تو تمہیں لینے آئی تھی۔ تاکہ ہم ایک ساتھ رہ سکیں۔ تم نے اتنی جلدی کیوں کی۔ بولو، روبینہ جواب دو''۔[۱۳]

یہ جملہ بڑا معنی خیز ہے اور اپنے اندر ایک الم ناک داستان سمیٹتے ہوئے ہے۔

مشرف عالم ذوقی نے کہانی اداس لمحوں کی خود کلامی کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے:

> ''کہانی 'اداس لمحوں کی خود کلامی' شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ عصمت چغتائی کی 'لحاف' مجھے کمزور لگی۔ لیکن آپ کی اس کہانی میں میں علامتیں اتنی واضح اور خوبصورت ہیں کہ کھلتی ہی چلی جاتی ہیں۔ پینتھر ایک ایسا استعارہ ہے جو عورتوں کی نفسیات کو مضبوطی سے سامنے رکھتی ہے۔ میرے لیے یہ حیران کر دینے والی دنیا ہے۔ یہ کہانی لحاف سے بہت بڑی ہے۔ شہر خموشاں، عورت ہونے کا احساس، پینتھر، گیلی قریں، روبینہ علی جیسی لڑکیاں، واڑن۔۔۔ اور ڈسٹ بن میں رکھتے ہوئے پینتھر۔۔۔ آپ نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ کہانی کیا سے کیا بننے جا رہی ہے۔۔۔ عصمت کی لحاف ہلنے لگی۔ دیوار پر ہاتھی جھولنے لگا۔ یہ اس کان کی ناکامی تھی اس لیے مجھے عصمت کی لحاف میں کہیں سے بھی ترقی پسندانہ رنگ نظر نہیں

آیا۔لیکن آپ کی کہانی پہلی سطر سے آخر سطر تک بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔غالبؔ نے کہا تھا اور چاہیئے وسعت میرے بیاں کے لئے۔۔۔تو یہ وسعت یہاں موجود ہے''۔۱۴؎

پروفیسر بیگ احساس نے شائستہ فاخری کے افسانوں پر کچھ اس طرح کے تاثرات پیش کئے ہیں:۔

''شائستہ فاخری عصرِ حاضر کے چاک پر فنی ہنرمندی اور تکنیکی تنوع کے ساتھ کو رے اور خوبصورت افسانے ڈھال رہی ہیں۔ تصوف اور روحانیت سے آ گہی،اساطیر کے درکاور نفسیاتی بصیرت سے انہوں نے ایک فکری نظام کی تشکیل کی ہے۔خواب اور حقیقت کے امتزاج سے وہ ایک ایسی فضا تعمیر کرتے ہیں جہاں ہماری اپنی دنیا کے جیتے جاگتے کردار کبھی پرندے بن کر اڑنے لگتے ہیں۔کبھی مچھلی کا روپ اختیار کر لیتے ہیں تو کبھی ان کا نصف جسم پتھر کا ہو جاتا ہے۔اور سینے سے دودھ کی بوندیں ٹپکنے لگتی ہیں۔کبھی اندر کا خوف انسانی شکل میں سامنے آ کھڑا ہوتا ہے،کبھی بے جان پینتھر تشنہ جذبات کی آسودگی کا سامان بن جاتا ہے۔کبھی وہ جسموں کے درمیان غائب ہو کر انہیں نئی لذتوں کے احساس سے ہم کنار کرتا ہے۔ شائستہ فاخری نے جنسی موضوعات کو اسی فن کارانہ رکھ رکھاؤ کے ساتھ برتا ہے۔ان کے افسانوں کی عورت عزت وحوصلے کی علامت ہے۔اس میں زندگی سے لڑنے اور جینے کی شدید ترین خواہش موجود ہے۔شائستہ فاخری ہماری دانشورانہ روایت کی امین ہی نہیں بلکہ تسلسل بھی ہیں''۔۱۵؎

شائستہ فاخری نے افسانوی دنیا میں ۲۰۱۲ء تک مصروف ومشغول ہوئی تھیں۔بعد میں انہوں نے ناول نگاری کی طرف رجوع ہوئیں۔اور ایک وسیع کینوس پر ایک کہانی لکھی۔تب جا کے ان کے ہاتھوں ایک ناول وجود پایا۔جس کا عنوان

'نادیدہ بہاروں کے نشاں' ہے۔ جو ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا۔ یہ ناول ۱۵۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا سائز ڈیمی ہے۔

'نادیدہ بہاروں کے نشاں' اکیسویں صدی کا ایک نیا روپ، نئی کہانی جس میں عورت کا نئے منظر نامہ کو لیکر ابھرا ہے۔ یہ ناول تخلیق کار نے آج کی نئی عورت اور اس سوچ کے ساتھ ساتھ ایک نئی فکر کو پیش کیا ہے۔ جس میں عورت کسی مرد کے بغیر جی سکتی ہے۔ وہ اکیلے رہ سکتی ہے۔ اور اکیلے ہی مسائل کو حل کر سکتی ہے۔ یہاں عورت کمزور نہیں بلکہ مضبوط ہے عورت کمزور وہاں ہوتی ہے جہاں وہ مرد کی ضرورت کو محسوس کرتی ہے۔ لیکن وہ جب مرد کی ضرورتوں کو خارج کر کے اپنا مقام بنانا چاہتی ہے تو اس وقت اس کا رول کیا ہوگا۔ اور یہی وہ پڑاؤ ہے جہاں شائستہ فاخری نے اپنے ناول کو عروج دیا۔ شائستہ فاخری نے اس ناول میں ایک نئے موضوع کو استعمال کیا ہے۔ وہ ہے ٹسٹ ٹیوب بے بی۔ جو روایتی فکشن کی کہانیوں سے الگ۔ اس ناول کا موضوع ہے حلالہ سے لے کر ٹسٹ ٹیوب بے بی تک۔

شائستہ فاخری اپنے اس ناول کے تعلق سے کہتی ہیں:۔

> ''لوگ کہتے ہیں کہ میں تانیثی ادب لکھتی ہوں، مگر میں ایک عورت کے مسائل، انکے دکھ درد، انکی منظر کشی کرتی ہوں۔ اور ان تمام عورتوں کی نمائندگی کرتی ہوں جو اپنے حق کی بات کہنے میں بھی خوف زدہ ہو جاتی ہیں۔ نادیدہ نہاروں کے نشاں ایسی ہی ایک عورت کی کہانی ہے جو زندگی کا ایک بڑا حصہ خاموشی میں گزار کر جب اپنے آپ کو پہچانتی ہے تو اپنی شناخت خود بناتی ہے۔ نہ صرف اپنے آپ کو بلکہ اپنی بیٹی کو بھی خودداری اور عزت کے ساتھ جینے کا درس دیتی ہیں۔ ایک طویل وقت کی ذہنی اور جسمانی اذیتیں اٹھانے کے بعد جب وہ مرد اساس معاشرے کے بنائے بے جا اصولوں کے خلاف کھڑی ہوتی ہے۔ تو نئی صدی کی نئی عورت کی تصویر سامنے آتی ہے۔ ایسی تصویر جو ہمیں نے معاشرے سے روشناس کراتی ہے''[۱۶]

شائستہ فاخری کی اس بات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کے یہاں معاشرتی غیر آہنگی عورتوں کے ساتھ ہو رہے ظلم و زیادتی کے خلاف ایک شدید احتجاج، اور انقلاب کا ایک پیش خیمہ، کیونکہ وہ خود ایک عورت ہیں وہ عورتوں کے مسائل، ان کے جذبات واحساسات سے بخوبی واقف ہیں۔

شائستہ فاخری نے اردو اور ہندی میں کہانیاں لکھنے کے علاوہ بہت سی کہانیاں ہندی سے اردو اور اردو سے ہندی میں ترجمہ کی ہیں۔ انہوں نے ادب میں ہر دو طرف قلم اٹھایا ہے۔ کسی بھی صنف کو خالی نہ چھوڑا۔ اس طرح انھوں نے ہندوستانی آئین میں درج زبانوں کی کچھ کہانیوں کا انتخاب کر کے اردو میں ترجمہ کیا۔ جس کا نام 'چوبیس زبانوں کی ہندو ستانی کہانیاں' یہ کتاب ۲۰۱۲ء میں شائع ہوئی۔ کتاب کے عنوان سے ہی پتہ چلتا ہے کہ اس میں ۲۴ کہانیاں ہیں۔ جو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔آسامی کہانی ۲۔اردو ۳۔اڑیا کہانی ۴۔انگریزی کہانی ۵۔بنگالی کہانی ۶۔بوڑو کہانی ۷۔پنجابی کہانی ۸۔تامل کہانی ۹۔تلگو کہانی ۱۰۔ڈوگری کہانی ۱۱۔راجستھانی کہانی ۱۲۔سنتھالی کہانی ۱۳۔سندھی کہانی ۱۴۔کنڑ کہانی ۱۵۔سنسکرت کہانی ۱۶۔کشمیری کہانی ۱۷۔گجراتی کہانی ۱۸۔کونکنی کہانی ۱۹۔مراٹھی کہانی ۲۰۔ملیالم کہانی ۲۱۔منی پوری کہانی ۲۲۔میتھلی کہانی ۲۳۔نیپالی کہانی ۲۴۔ہندی کہانی۔

شائستہ فاخری اس کتاب کے حوالے سے پیش لفظ میں یوں بیان کی ہیں:

> ''اردو ہندی میں کہانیاں لکھتے لکھتے اور ان دو زبانوں کے علاوہ انگریزی اور سنسکرت زبانوں کے توسط سے ہندوستان کی مختلف زبانوں کی کہانیاں پڑھتے پڑھتے میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ ہندوستان کی آئین میں مندرجہ زبانوں کی کہانیوں کا اردو میں ترجمہ کیا جائے اور کتابی شکل میں شائع کرایا جائے۔ میں اپنے ارادے اور منصوبے کے تحت کام کی ابتدا کی اور ہندوستان کی زبانوں کی ان کہانیوں کو تلاش کرنا شروع کیا''۔[۱۷]

وہ آگے لکھتی ہیں:

''میں نے کہانیوں کا انتخاب کرتے وقت کئی امور کا خیال رکھا ہے۔ ہندوستانی تہذیب وتمدن، یہاں کے رسم ورواج، یہاں کے رہن سہن اور یہاں کے ماحول کی صحیح تصویر کشی کی گئی ہے۔ مثلاً متھیلی کھانی کا اپنا رنگ ہے تو راجستھانی کہانی کا اپنا کلچر بوڑو کہانی کی تہذیب ہے تو کشمیری کہانی کا اپنا انداز۔ بنگالی کہانی وہاں کی کوئی تاریخ ہے تو آسامی کہانی میں وہاں کی رسوم ورواج، غرض ہر کہانی کا موضوع اور تقسیم الگ الگ ہے۔ اظہارِ بیان کی تشکیل وتعمیر بھی اس کی مناسبت سے ہوئی ہے۔ میں نے ان کہانیوں کا ترجمہ کرتے وقت کہانی کی اصل روح کو پیش نظر رکھا ہے۔ اور اس امر پر سب سے زیادہ توجہ کی ہے کہ کہانی ترجمہ ہوتے ہوئے بھی اصل زبان کی کہانی معلوم پڑے تاکہ کہانی اور کہانی کی بنیادی موقف اور اس کا پورا منظر نامہ اپنی ہندوستانی تہذیب کے تناظر میں نمایاں اور عکس ریز ہو سکے۔ میں فنِ ترجمہ کے اصولوں کو بھی سامنے رکھا ہے۔ تاکہ کہیں کسی کہانی میں جھول نہ پیدا ہو''۔ ۱۸

ان دونوں بیانات سے موصوفہ کے ترجمے کرنے کا مقصد اور ان کے فن ترجمہ نگاری پر روشنی پڑتی ہے۔

شائستہ فاخری کا دوسرا ناول 'صدائے عندلیب برشاخِ شب' ہے۔ یہ ناول ۲۰۱۴ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اور اسے کافی شہرت حاصل ہوئی۔ یہ ناول ۳۱۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا کینوس بہت وسیع ہے۔ یہ ناول ۳۱۳ صفحات پر مشتمل ہے۔

'صدائے عندلیب برشاخِ شب' جو ایک عورت کی کہانی ہے، جسے عورت کی زبانی بیان کیا گیا ہے۔ یہ ناول تانیثیت کی تحریک سے بری طرح متاثر ہے۔ جس میں عورت کے استحصال، اس پر ہونے والے ظلم اور ناانصافی کے خلاف صدائے احتجاج ملتی ہے۔ اس ناول کا بنیادی نکتہ عورت کا وجود ہے۔ جس میں اعلیٰ سوسائٹی کے افراد بھی ہیں اور

درمیانی طبقہ کے بھی لوگ ہیں۔اور یہ ناول خود کلامی کی تکنیک میں تحریر کیا گیا ہے۔شائستہ فاخری کا بیان ہے:۔

''یہ ناول اعلیٰ طبقے اور بالکل نچلے طبقے کی عورتوں کے مسائل پر مبنی ہے'صدائے عندلیب برشاخِ شب'ازدواجی زندگی کی ناکامی کا شاخسانہ ہے'۔یہ رائے میں تسلیم نہیں کرتی کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو رحمت علی اور ڈاکٹر رحمان جیسے کردار سامنے نہ آئے ہوتے۔ہاں سچ یہ ہے کہ صدائے عندلیب مردوں سے الگ عورتوں کے حوصلوں کی اڑان کی داستان ہے''۔۱۹

اس ناول میں نازنین بانو مرکزی کردار ہے۔پوری کہانی اسی کے اردگرد گھومتی ہے۔بچپن میں ماں کے سائے سے محرومی،سوتیلی ماں کی بے توجہی اور باپ کی بے اعتنائی اور کشو سے شادی،کشو جس میں سوائے دولت ہونے کی اور کوئی قابلِ ذکر خوبی نہ تھی۔شادی کی پہلی رات ہی نازنین بانو کو خبر ہو جاتی ہے کہ شہر کی بستی کی ایک لڑکی ستارہ،کشو(کاشف اصغر) کی زندگی میں پہلے سے ہے۔اس کے باوجود نازنین نے زندگی کا سفر طے کرتے ہوئے ایک فیملی ویلفر منسٹر بن جاتی ہے ۔ مگر ایک عورت کے ناطے وہ کاشف اور ستارہ کے رشتے کو لیکر جلتی ہے۔نازنین بانو،کاشف اصغر،اور ستارہ کے مثلث پر ہی ناول کی عمارت کھڑی ہے۔لیکن اس کے علاوہ کئی چھوٹے کردار بھی ہیں جو ناول کے مرکزی پلاٹ کو آگے بڑھانے میں مدد دیتے ہیں۔گھر سے شروع ہو کر سماج تک پھیلے اس ناول میں انسان کی سماج میں اپنا تشخص قائم رکھنے کا جائز و ناجائز کوشیش، سیاست و معیشت،عورت کے رشتے، بحث و تکرار کے درمیان ایک عورت کے مسلسل تبدیل ہوتے ہوئے جذبات قاری کے دل میں گھر کر جاتے ہیں۔اور دوسری طرف اونچے طبقے کے مردوں کے ذریعہ ذلت کے گڑھے میں ڈھکیلی گئی ایک عورت کا HIV جیسی مہلک مرض کو ہتیار بنا کر بھیانک انتقام کی دلدوز کہانی اور سروگیٹ مدد surrogate mother) جیسے جدید موضوعات پر بحث ایسی چیزیں ہیں جو ناول کو روایتی فکشن سے الگ کر دیتی ہیں۔۲۰

شائستہ فاخری اس ناول میں لکھتی ہیں:

''ہم عورتیں اپنے شوہروں کو لے کر کتنی خوش فہمیوں کا شکار رہتی ہیں۔اور وہ ان

خوش فہمیوں کے پنجرے کو پہلی رات ہی شوہر اپنی بیوی کے لیے تیار کر دیتا ہے۔اور پھر اپنے حصار میں لے کر اسے یہ سمجھاتا ہے کہ ایک مرد کے بغیر یہ ساری نیا اس جیل خانے کی طرح ہے۔ جہاں عورتوں کا صرف استحصال ہوتا ہے۔ شوہر کی دہلیز چھوڑ انہیں کہ باہر بیٹھے مردوں کی شکل میں گدھ اس کی بوٹیاں نوچ ڈالیں گے۔خوف کی خمیر سے تیار کی گئی عورتیں پھر چاہے کچھ بھی ہو جائے اپنے شوہر کی دہلیز نہیں چھوڑتیں۔ میں بھی چھوڑنا نہیں چاہتی ہوں۔آخر دم تک اس لیے کشو کے ساتھ محبت کا ڈرامہ کھیل رہی تھی، ایک طویل ڈرامہ''۔۲۱

ناول کے اس اقتباس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ آخر کار عورت پر اس کا شوہر کتنا ہی ظلم ڈھاتا رہے مگر وہ اس کی دہلیز سے باہر نہیں جاسکتی۔

شائستہ فاخری نے صرف کہانیوں ہی کا ترجمہ نہیں کیا ہے، بلکہ ایک ناول کو بھی انہوں نے ہندی سے اردو میں منتقل کیا ہے۔انہوں نے ''نرمل ورما کا ہندی ناول 'انتم ارڑے' کا اردو میں آخری بیاباں کے نام سے ترجمہ کیا۔ یہ ناول رسالہ 'آج' پاکستان کے ادبی کتابی سلسلہ شمارہ ۷۵ میں شائع ہوا۔ یہ ناول ۲۰۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ناول ابھی کتابی شکل میں شائع نہیں ہوا ہے۔ناول کے تعلق سے جاننے سے پہلے ہم نرمل ورما کو جان لیں تو بہتر ہوگا۔

ہندی کے جدید فکشن میں نرمل ورما ایک نمایاں اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔اور آج کے پڑھنے والے ان کے نام اور کام سے اچھی طرح مانوس ہیں۔ ہندی کی نئی کہانی کی تحریک میں شامل نرمل ورما اپنے مخصوص اسلوب اور لسانی رویے کی بدولت جدید ہندی ادب میں ایک بے مثل مقام رکھتے ہیں۔نرمل ورما کا مخصوص نثری اسلوب ہے۔ جو ان کے ناول میں اور بھی زیادہ نکھری ہوئی صورت میں نظر آتا ہے۔ وہ انسانی زندگی اور رشتوں کی نہایت نازک تفصیلوں کو بڑے موثر انداز میں گرفت میں لاتے ہیں۔اس کے علاوہ کم بیانی بھی نرمل ورما کے فن کا اہم خاصہ ہے۔۲۲

شائستہ فاخری نے انتم ارڑے، ناول کا ترجمہ آخری بیاباں کے نام سے کیا ہے۔اس ناول میں انہوں

نے یہ احساس دلانے کی کوشش کی ہے کہ زندگی کی تفصیلوں کے اظہار کے کتنے ہی موثر اور خوبصورت سانچے ہمارے ہاتھ سے جاتے رہے۔اوران کو بحال کرنے سے ہماری زبان کے تخلیقی اظہار میں کتنی وسعت پیدا ہوسکتی ہے۔اورشائستہ نے اس ناول کو پیش کرتے ہوئے یہ خیال بھی رکھا ہے کہ اردو کے مقامی الفاظ جنہیں ایک دور کی مخصوص لسانی سیاست کے باعث متروک قرار دے کر ذخیرۂ الفاظ سے باہر کیا گیا تھا، جہاں تک ممکن ہو جوں کے توں برقرار رکھے ہیں۔تا کہ نرمل ورما کی نثر کا مخصوص لہجہ اردو پڑھنے والے تک پہنچ سکے۔

شائستہ فاخری نے ایک ریڈیائی ڈرامہ بھی لکھا ہے۔جس کا عنوان ہے ''حاشیے پر لکھی تحریر''۔جو ۱۳ قسطوں میں آل انڈیا ریڈیو دلی اور لکھنؤ سے نشر ہوا تھا۔یہ ڈرامہ شائستہ فاخری نے یہ ڈراما زندگی کے سپترنگی تانے بانے کے بیچ بنا یہ ہے۔گیا ڈرامہ، جس میں عورتوں کے فطری جذبات اور فطری کمزوریوں کو پیش کیا گیا ہے۔علاوہ ازیں زندگی کی ان سچائیوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔جو وقت، حالات، معاشرے، مذہب اور برادری سے اوپر اٹھ کر رونما ہوتی ہے۔یہ ڈرامہ فرمان علی اور نصرت خاں کے خاندانی پیشِ منظر میں لکھا ہے۔ایک ہی گھر میں ایک ہی ماحول میں پرورش پائی، پروان چڑھی دولڑکیاں، دوسگی بہنیں۔۔۔سائرہ اور خوشبو جب زندگی کے اس موڑ پر پہنچتی ہیں جہاں انہیں اپنے راستے، اپنی منزل، کے لیے فیصلے لینے ہوتے ہیں تو دونوں کے فیصلے الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ایک کمزور پڑ جاتی ہے۔اور دوسری مضبوط ہوتی چلی جاتی ہے۔کہاں کمی آتی ہے اور کیوں آتی ہے۔کہاں بدلتے ہیں نظریے اور کیوں بدلتے ہیں۔بہت سے چلتے ہوئے سوالات جو حاشیے پر لکھی تحریر ڈرامے میں اٹھائے گئے ہیں۔یہ ڈرامہ انہوں نے فلیش بیک تکنیک میں لکھا ہے۔

جہاں تک شاعری کا تعلق ہے اب تک ان کا کوئی بھی شعری مجموعہ منظرِ عام پر نہیں آیا ہے۔تاہم انکی کچھ نظمیں دو ایک رسالوں میں شائع ہوئی ہیں۔میں ان نظموں کا ذکر کرنا مناسب سمجھتی ہوں۔شائستہ فاخری نے بچپن سے شاعری کی طرف متوجہ تھیں۔تیرہ سال کی عمر میں انہوں نے ڈائری کا استعمال کرنا شروع کیا تھا۔انہوں نے شاعری کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے لکھے تھے۔لیکن یہ ڈائری سفر کے دوران کہیں چھوٹ گئی۔اس دور کی شاعری کے یہ دو بند ملاحظہ ہوں:

رات کی بے پنہاں تلخیوں میں جب

احساسِ تنہائی زہر گھولنے لگی
بستر کی سلوٹوں پر جسم رگڑ رگڑ

کھوجوں تجھ کو یوں ہی کب تک
آشاؤں کی چھاؤں میں
تیری ی یادوں کی کھنڈر میں

عمر بتائی جاؤ میں۔
دکھ کی گھٹا جب بہت آتی ہے
تمہاری یاد بہت آتی ہے۔
آنسوں کے میگھ برستے ہیں

سوندھی دیہہ مہک جاتی ہے
ساون کا مہینہ ہے
نتھ کنگن سب سونے ہی ں
تم داسی ٹھرے دور تھام کے
میں سیج ادھوری لئے کھڑی ہوں۔۲۳

شائستہ فاخری نے شاعری میں خاص کر صنفِ نظم پر توجہ دینے اور غزل نہ کہنے کی وجہ بتاتے ہوئے لکھتی ہیں:

''میں غزلیں کم کہتی ہوں۔اس لیے باقاعدہ کوئی استاد مقرر نہیں کیا۔شاعری میں میرا

میدان نظم نگاری ہے۔ جہاں تک غزل لکھنے کی بات ہے تو میرے اندر ابھی تک دو مصرعوں میں اپنی بات کہنے کا ہنر پختہ نہیں ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نظمیں کہنے کی طرف زیادہ مائل ہوں۔ اور اس میدان میں سلیقے سے بات نبھانے کی کوشش کرتی ہوں۔ میں نے کئی غزلیں کہی ہوں۔ لیکن میں ان سے مطمئن نہیں ہوں''۔۲۴

شاعر ہو یا شاعرہ جب شاعری کا آغاز کرتے ہیں تو وہ اہم اصناف سخن مثلاً غزل، نظم، رباعی، قطعہ وغیرہ پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ اور آگے جا کر اپنے لیے ایک صنف مخصوص کر لیتے ہیں۔ لیکن شائستہ فاخری کا معاملہ یہ نہیں ہے وہ صرف خالص نظم گو رہنا چاہتی ہیں۔ اور کسی دوسری صنف کی طرف دیکھنا بھی نہیں چاہتیں۔

شائستہ فاخری کی نظموں پر چودھری بن النصیر نے مضمون لکھا ''شائستہ فاخری کے نئے فکری افق کا تخلیقی سفر'' جس میں انہوں نے ان کی نظموں کے تعلق سے اور ان کی فکر، سوچ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے:۔

''میرے خیال میں شائستہ فاخری کی شاعری سادگی اور معصومیت کی شاعری ہے۔ ان کے یہاں خواب اور خاک کا رشتہ ان معنوں میں ابھر کر آتا ہے کہ زمین سے اس کا رشتہ کتنا ٹھوس اہم ہے۔ وہ اپنے زمانے کی فکر بلوغت کا ساتھ دے رہی ہیں۔ ان کی نظمیں کیفیتوں سے مملو ہیں۔ ہر نظم کوئی نہ ایسی کیفیت کو پیش کرتی ہے۔ جو ہمارے ذہین کو لمحۂ فکر یہ عطا کرتی ہے۔ ان کے یہاں رنگا رنگ کی کیفیتوں کا ایک ایسا جہاں آباد ہے جو ہمیں بہت دور تک سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں شائستہ فاخری اپنی نظموں میں جہاں معنی تخلیق کرتی ہیں۔ وہ ان کے وجود کے اثبات کی ایک صورت ہے۔ جو انہیں زندگی کی بے معنویت اور جبریت کے کرب سے نجات بخشتا ہے''۔۲۵

شائستہ فاخری نے کئی نظمیں لکھی ہیں۔ جیسے وجود کی بے سکونی، اداس لمحوں کی خود کلامی، بے تحریر کتبہ، تہذیب بھول کر جینا، زندگی کا سچ، بے سمت سفر کا حاصل زمین پرواز نہیں کرتی، سوکھا دن گیلی راتیں، صدائے عندلیب، جذبوں کی

خلوت میں، آنکھیں بند کرو، سجدوں سے بے زاری کیسی، نہ ختم ہونے والا انتظار وغیرہ ہیں۔ یہ نظمیں مختلف رسائل میں شائع ہوئی ہیں۔اس کے علاوہ اور بھی کئی نظمیں ہیں جو ابھی شائع نہیں ہوئی ہیں۔ان سب نظموں کو اکٹھا کر کے شائستہ فاخری نے ''کوئی موسم رہے جاناں'' کے نام سے شعری مجموعہ تیار کیا ہے۔ جو ابھی شائع نہیں ہوا ہے۔

ان کی ایک نظم 'وجود کی بے سکونی' ملاحظہ ہو:

اندھیری رات کے
گہراتے سائے ہیں

بہت چپکے سے تم در آتے ہو
اور اپنی سانسوں کی تھکی گرمی
سرایت کر کے
میرے اس بدن میں
اک تماشا دیکھتے ہو۔ پوروں کے چٹخن کا

تم چلتے ہو، دھیمے دھیمے
اندھیارے کے جگنو بن کے
اور جنگل کے آہو بن کے

میرے جسم کے آنگن میں
میری روح کے اندر۔[۲۶]

شائستہ فاخری کے یہاں موضوعات کی کمی نہیں ہے۔انہوں نے تنہائی، زمانہ، بے بسی، شکست، محرومی، موت، پرندہ، خواب، سانس، دھوپ، ہوا، زم، رات، مکان، سورج، جیسی لفظیات کو استعاراتی اور علامتی معنویتیں دی ہیں۔ان کا خاص استعارہ 'خواب' ہے۔جس کو انہوں نے بار بار اپنی نظموں میں پیش کیا ہے۔جن سے موضوع میں وسعت اور فکر میں بالیدگی پیدا ہوئی ہے۔

شائستہ فاخری کی اور بھی کئی کتابیں ہیں۔جو ابھی شائع نہیں ہوئی ہیں۔ان میں سے ناول، افسانوی مجموعہ، شعری مجموعہ، ترجمے ہندی وغیرہ ہیں جو درجِ ذیل ہیں:

۱۔مجاز ویکتو اوم کرتتو

۲۔گوری سوے سیج پر (ناول)

۳۔خشک پتوں کی موسیقی (افسانوی مجموعہ)

۴۔ایشیا کی منتخب کہانیاں (ترجمہ ہندی)

۵۔پاکستانی شاعرات: کلامکی انتخاب (ہندی)

۶۔بین الاقوامی کہانیوں کے تراجیم (ہندی)

۷۔کوئی موسم رہے جاناں (شعری مجموعہ)

مجموعی طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ شائستہ فاخری ایک تانیثی فکر رکھنے والی مصنفہ ہیں۔انہوں نے تقریباً فکشن کے سبھی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ان کی تحریروں میں آج کی دور کی عورت اور اسکی زندگی سے جڑے ہوئے مسائل ملیں گے۔عورت کی نفسیات اس کی ذہنی کشمکش، اس کی جسمانی ضروریات اور نفسیات، مرد عورت کی باہمی رشتوں کی پیچیدگیاں عورت پر ہونے والے ظلم وستم اور عورت کی زندگی سے جڑے ہوئے ہر پہلو کو بڑی چابکدستی سے اپنی تحریروں میں جکڑ کر رکھا ہے۔ان کی تحریریں حقیقت بیان کرتی ہیں۔اور ان کے علاوہ ایک اور خوبی یہ ہے کہ کہانی پڑھتے وقت ایسا لگتا ہے کہ تخلیق کار خود اس کہانی کا حصہ ہیں۔ان کی تحریریں سادہ سلیس زبان میں نظر آتی ہیں۔ان کا ہر ایک افسانہ

زندگی کی تمام جہات سے پوری طرح واقف ہے۔ان کے افسانوں میں اندازِ بیان کہیں خطیبانہ، واعظانہ اور ناصحانہ ہے۔تو کہیں ان کا لب ولہجہ ان کی خاندانی ماحول کے زیرِ اثر صوفیانہ، شاعرانہ اور اساطیری رنگ وفضا میں ڈوبا ہوا ہے۔ان کے تحریروں میں عورت کا ایک رنگ جیتا جاگتا نظر آتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو کے عصری افسانوی ادب کی دنیا میں ان کے افسانے ایک نئی راہ سے آشنا کراتے ہیں۔

---

حوالہ:


۱ افتخار امام صدیقی، مشمولہ شائستہ فاخری سے ادبی مکالمہ، رسالہ شاعر، ممبئی، مارچ ۲۰۱۲، ص ۱۴

۲ علی احمد فاطمی پروفیسر، مشمولہ ترے آسماں اور بھی ہیں، ماہنامہ چہارسو، جلد ۲۴، شمارہ مئی۔ جون ۲۰۱۵، پاکستان، ص ۵۔

۳ سید ضمیر جعفری، مشمولہ ایک مختصر مکالمہ شائستہ فاخری، ماہنامہ چہارسو، جلد ۲۴، شمارہ مئی۔ جون ۲۰۱۵، پاکستان، ص ۱۴۔

۴ افتخار امام صدیقی، مشمولہ شائستہ فاخری سے ادبی مکالمہ، رسالہ شاعر، ممبئی، مارچ ۲۰۱۲، ص ۲۳۔

۵ فاری پاشا، اوراقِ دل، ماہنامہ چہارسو، جلد ۲۴، شمارہ مئی۔ جون ۲۰۱۵، پاکستان، ص ۵۴۔

۶ شائستہ فاخری، مشمولہ میرا قلم، ہرے زخم کی پہچان، اتر پردیش، لکھنؤ، ۱۹۹۲ء ص ۱۰۔

۷ فاری پاشا، اوراقِ دل، ماہنامہ چہارسو، جلد ۲۴، شمارہ مئی۔ جون ۲۰۱۵، پاکستان، ص ۵۶۔

۸ گوپی چند نارنگ پروفیسر، مشمولہ شائستہ فاخری کے افسانے، ماہنامہ چہارسو، جلد ۲۴، شمارہ مئی۔ جون ۲۰۱۵ء، پاکستان، ص ۲۰۔

۹ https://rekhta.org/ebooks/udaas-lamhon-ki-khud-kalami-shaista-fakhri--ebooks

۱۰ ایضاً ص ۳۲۔

۱۱ ایضاً ص ۳۸۔

۱۲ سید ضمیر جعفری، مشمولہ ایک مختصر مکالمہ شائستہ فاخری، ماہنامہ چہارسو، جلد ۲۴، شمارہ مئی۔ جون ۲۰۱۵، پاکستان، ص ۱۳۔

۱۳ مغنی تبسم پروفیسر مشمولہ جدید دور کی نمایاں افسانہ نگار، ماہنامہ چہارسو، جلد ۲۴، شمارہ مئی۔ جون ۲۰۱۵، پاکستان، ص ۲۶۔

۱۴ فاری پاشا، اوراقِ دل، ماہنامہ چہارسو، جلد ۲۴، شمارہ مئی۔ جون ۲۰۱۵، پاکستان، ص ۵۵۔

۱۵ ایضاً ص ۵۴۔

۱۶ شائستہ فاخری مشمولہ سوالنامہ۔

۱۷ https://rekhta.org/ebooks/choubis-zabanon-ki-hindustani-kahaniya-ebook

۱۸ ایضاً

۱۹ سید ضمیر جعفری، مشمولہ ایک مختصر مکالمہ شائستہ فاخری، ماہنامہ چہارسو، جلد ۲۴، شمارہ مئی۔ جون ۲۰۱۵، پاکستان، ص ۱۴۔

۲۰ نوشاد کامران مشمولہ صدائے عندلیب برشاخِ شب، ماہنامہ آج کل، اکتوبر ۲۰۱۴ء، نئی دہلی ص ۴۸۔

۲۱؎ شائستہ فاخری مشمولہ صدائے عندلیب برشاخِ شب، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۴۱ء ص ۳۷، ۳۸۔

۲۲؎ جمل کمال مشمولہ آخری بیاباں شائستہ فاخری، رسالہ آج ،شمارہ ۷۵ جنوری، مارچ ۲۰۱۳ء ص ۶۔

۲۳؎ سید ضمیر جعفری، مشمولہ ایک مختصر مکالمہ شائستہ فاخری، ماہنامہ چہارسو، جلد ۲۴، شمارہ مئی۔جون ۲۰۱۵، پاکستان، ص ۱۱۔

۲۴؎ افتخار امام صدیقی، مشمولہ شائستہ فاخری سے ادبی مکالمہ، رسالہ شاعر، ممبئی، مارچ ۲۰۱۲، ص ۱۹۔

۲۵؎ چودھری بن النصیر مشمولہ شائستہ فاخری کے نئے فکری اُفق کا تخلیقی سفر، ماہنامہ چہارسو، جلد ۲۴، شمارہ مئی۔جون ۲۰۱۵، پاکستان، ص ۳۲۔

۲۶؎ ایضاً

# تیسرا باب: ناول ''نادیدہ بہاروں کے نشاں کا تنقیدی مطالعہ''

موضوع:۔

شائستہ فاخری کا ناول 'ناول نادیدہ بہاروں کے نشاں' ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا۔شائستہ نے اس ناول کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ہر حصے کا ایک خاص عنوان ہے۔ پہلا عنوان ''تو شب آفریدی چراغ آفریدم'' دوسرے حصے کا عنوان 'اس شب کی اڑان دیکھتے ہیں' تیسرے حصے عنوان ہے 'شب کی کھڑکیاں اور دروازے' اور چوتھے حصے عنوان ہے 'پسِ پردہ شب' اس کے علاوہ شائستہ نے احمد مشتاق کے شعر سے اس ناول کی شروعات کی ہے۔

شعر ملاحظہ ہوں۔

جب پرندے پسِ دیوار خزاں بولتے ہیں
دل میں نادیدہ بہاروں کے نشاں بولتے ہیں

شائستہ نے احمد مشتاق کے اس شعر کے مصرعۂ ثانی سے 'نادیدہ بہاروں کے نشاں' کو لے کر اس ناول کا عنوان رکھا ہے۔ شائستہ فاخری نے 'نادیدہ بہاروں کے نشاں' ناول کو ایک فلیش بیک تکنیک میں لکھا ہے۔اس ناول کا موضوع ''حلالہ سے لے کر لسٹ ٹیوب بے بی تک'' ہے۔یعنی اس ناول کے دو مدّے ہیں۔ایک حلالہ اور دوسرا لسٹ ٹیوب بے بی۔اس ناول کے موضوع سے پتہ چلتا ہے کہ اکسویں صدی کی عورت کی نئی سوچ اور اس کا نظریہ کتنا مختلف ہے۔

شائستہ فاخری نے اس ناول میں عورت کی ایک ناکام ازدواجی زندگی کو پیش کیا ہے۔اس کے ذریعہ فنکار نے عورت کی زندگی کی ناکامی کے نکتہ کو پیش کرتے ہوئے ایک مضبوط عورت کو ہمارے سامنے لا کر کھڑا کیا۔ جو کہ عورت مرد کے بغیر بھی اپنی زندگی جی سکتی ہے۔اسے زندگی میں مرد کا ہونا ضروری نہیں ہے۔اس میں عورت مرد کی ضرورتوں خارج کر کے اپنا الگ مقام بنانا چاہتی ہے تو اس وقت اس کا رول کیا ہوگا؟ یہی ناول نگار نے اپنے ناول کو عروج دیا۔

ناول ایک ایسی صنفِ نثر ہے جس میں ہماری زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔اسی لحاظ سے ہم یہ ناول 'نادیدہ بہاروں کے نشاں' پر نظر ڈالیں تو یہ ناول اپنے سماج و معاشرے میں سانس لینے والی ان تمام مجبور و بے بس عورتوں کا المیہ ہمیں صاف نظر آتا ہے۔ جو ہر حال میں زندگی گذارنے کے لیے مجبور ہے۔اس ناول میں عورت پر ظلم و ستم ہونے والے واقعات کی

نشاندہی کی گئی جو آج بھی ہمارے سماج میں موجود ہیں۔اس ناول میں عورت کے وجود کو مکمل طور پر سامنے لا کر کھڑا کیا ہے۔

شائستہ فاخری نے اس ناول میں مذہب کے نام پر فائدہ اٹھانے والے ان مسلمانوں کے لیے ایک نشانہ بنا کر فرحان جیسا کردار ہمارے سامنے لا کر کھڑا کیا ہے۔جو عورت کو صرف پاؤں کی جوتی سمجھتا ہے۔عورت کو جب چاہا استعمال کیا وہ جب چاہا پھینک دیا۔ان سب واقعات کا سامنے ایک عورت ہی کو کرنی پڑتی ہے۔یہاں فنکار صرف یہ بتانا چاہتی ہیں کہ عورت صرف جسم کا نام نہیں بلکہ وہاں بھی ذہن و دماغ کی روشن قندیلیں منور ہیں۔اور وہاں بھی جذبات و احساسات کا ایک دریا موجزن ہے۔وہاں بھی دل کی دنیا آباد ہوتی ہے مگر افسوس:

> ''عورت کو صرف سمجھنا کافی نہیں ہوتا تانیہ، سمجھتے تو بہت سے لوگ ہیں۔عورت کو کھولنا ہوتا ہے۔اور کھولنے کا ہنر سب کے پاس نہیں ہوتا۔کھولنے کا مطلب عورت کو ننگا کرنا نہیں ہے۔۔۔اس کے ریشے ریشے میں ڈوب کر اسے برآمد کرنا ہوتا ہے۔مثال کے لیے، وہ اپنی چھوٹی سے چھوٹی خواہش کے لیے مرد کی آنکھوں میں جھانکتی ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی پسند کے لیے۔۔۔صرف کیئر کرنا سب کچھ نہیں ہوتا۔عورت کو جیتنا ہوتا ہے۔ایان میری کیئر سے زیادہ اپنی شرافت کی کنیچلی سنبھالے ہوا تھا۔اور فرحان مرزا اپنی غلطی کے لیے ندامت شکست آئینہ لیے کھڑے تھے۔۔۔مجھے دونوں ہی گوارہ نہیں تھے۔''[۱]

یہاں شکست خردہ علیزہ زندگی کے غم کو ڈھاتی ہوئی مجبور بے بس نظروں سے تنہا اپنی زندگی اور اس کی نصیب پر روتی ہوئی جب اپنے آپ میں ایک نیا وجود کو ڈھونڈتی ہے تو اس کا روپ کا اور اس کا اصل چہرہ کیسا ہوگا؟ علیزہ کی اس گفتگو کو دیکھئے:

> ''زندگی کبھی ختم نہیں ہوتی۔۔۔زندگی ایک لمحے کا سچ ہے جو اچانک حیران کر جاتی ہے۔چپکے سے بند روزن کھولتی ہے۔۔۔آہستہ سے جگاتی ہے کہ آنکھیں کھولو۔۔۔عمر کے حصار سے باہر نکلو۔۔اور اس اندھیرے سے بھی جس کی نگہبانی نے تمہارے جسم سے

سارارس نچوڑ لیا ہے۔۔۔وہ رس تم میں اب بھی ہے علیزہ۔۔باہر آؤ۔۔یہ لوگ ایسے بدنما کیڑے ہیں۔۔جو تمہارے جسم کو جونک بن کر چوس ڈالیں گے''۔۲؎

**واقعہ نگاری:۔**

ناول نادیدہ بہاروں کے نشاں' کی واقعہ نگاری میں ایک توازن قائم ہے۔اس ناول کی کہانی فلیش بیک اور شعور کی رو کی تکنیک میں آگے بڑھتی ہے۔ناول کی شروعات ہی فلیش بیک میں ہے۔ناول کی کہانی کچھ اس طرح ہے کہ تانیہ اور علیزہ دونوں بچپن کی سہلیاں ہیں۔تانیہ ایک ڈاکٹر ہے۔جو خوش حال زندگی جی رہی ہے۔جبکہ علیزہ کی زندگی اس کے برعکس ہے۔علیزہ کے ماں باپ کا بچپن ہی میں انتقال ہوجاتا ہے۔ماں نے مرنے سے پہلے ہی علیزہ کی شادی کا سب سامان طئے کر جاتی ہے۔اوراس کی شادی ایک بڑے مرزا گھرانے کے لڑکے فرحان مرزا سے ہوتی ہے۔اس کے سسرال والوں میں ایک چچیرا بھائی اعیان مرزااور بہن بلقیس بھی رہتی ہیں۔بچپن سے فرحان کو اعیان سے بے حد نفرت رہی ہے کیونکہ اس کی ماں ہندو تھی۔اوراس کے رگوں میں ہندو ماں کا خون دوڑ رہا ہے۔فرحان،علیزہ اور اعیان ایک گھر میں رہتے تھے۔فرحان کو علیزہ سے بے پناہ محبت تھی۔مگر اپنے بھائی سے نفرت کی وجہ سے وہ شکی مزاج کا نکلا۔وہ اپنے تایازاد اعیان کو ہمیشہ شک کی نظروں سے دیکھتا تھا۔علیزہ کو ہنسی مذاق سے تو دور ضروری بات چیت کو بھی پسند نہیں کرتا تھا۔کیونکہ فرحان علیزہ سے بے حد محبت کرتا تھا۔لیکن جب انسان کے دل میں محبت زیادہ بڑھ جاتی ہے تو شک میں تبدیل ہوجاتی ہے کہ کوئی اسے چھین نہ لے۔یہی حال فرحان مرزا کا ہوجاتا ہے۔فرحان کے اس بیان کو ملاحظہ فرمائیں:

''علیزہ! میں تم سے بے تحاشا محبت کرتا ہوں۔تمہارے بغیر میں جی نہیں سکتا۔تم ہی تو ہو ایک جسے میں مکمل طور پر اپنا کہہ سکتا ہوں''۔۳؎

فرحان مرزا علیزہ سے بے پناہ محبت کرتا ہے لیکن اعیان کا خیال آئے تو آپے سے باہر ہوجاتا ہے کہ کہیں علیزہ اعیان کی نہ ہوجائے۔اس ڈر سے فرحان نے علیزہ کو لے کر لکھنؤ چلا جاتا ہے۔وہاں دونوں خوش حال زندگی بسر کرتے رہتے ہیں اتنے میں اعیان کھانے کی پیکٹ لیکر آتا ہے۔پہلے تو فرحان اعیان سے ڈر رہا تھا لیکن پھر بھی ایک ہی گھر میں رہتے ہیں اس کی

وجہہ سے علیزہ کی زندگی میں الجھنیں پیدا ہوتی گئیں، زندگی عذاب بنتی گئی۔ مگر پھر بھی علیزہ اس کے ساتھ زندگی جینے کو تیار ہو جاتی ہے۔ اب علیزہ کے لیے زندگی میں مشکل مراحل آنا شروع ہو گئے۔ یہاں اقتباس دیکھئے:

''اس نے اپنے آپ کو سمجھا لیا کہ مرد اسی طرح کے ہوتے ہیں سب عورتیں کم وبیش اسی طرح جھیلتی ہیں تو پھر اس کے کونسے سرخاب کے پر لگے ہیں۔ ایک معمولی گھر کی معمولی لڑکی اور کہاں مرزا کا جانا مانا گھرانہ ہاں اتنا ضرور تھا کہ علیزہ کے والدین نے اسے اعلیٰ سوچ اور فکر کا میعار دیا تھا۔ زندگی کو برتنے کا ایک رویہ دیا تھا۔[۴]

اور پھر وہ ڈاکٹر تانیہ کی نصیحت کو یاد کر کے چپ ہو جاتی ہے۔ یہاں تانیہ کی زبانی سنیے:

''علیزہ ہر لفظ کو تول کر سوچ سمجھ کر بولنا، یہاں تک کہ فرحان کے آگے بھی اپنا حالِ دل بیان کرنے نہیں بیٹھ جانا، الجھا ہوا انسان ہے کسی بات کا کونسا مطلب نکالے اور پھر تمہاری زندگی عذاب بن جائے۔ ہر قدم سوچ سمجھ کر اُٹھانا''۔[۵]

فرحان مرزا کا بات بات پر غصہ کرنا، اور ذرا سی بات پر اکڑنا، اعیان کے لیے کوئی بھی کام انہیں گوارا نہیں ہوتا تھا۔ اتفاق سے فرحان کے والد جو کی دوسرے گاؤں میں تھے اچانک سے بیمار ہو جاتے ہیں۔ والد کی اس حالت سے فرحان نے کہا کہ ہم تینوں نہیں جا پائیں گے کیونکہ باہر بارش ہو رہی ہے۔ میں فون پر اطلاع کر دونگا یہ کہ کر وہ چلا گیا۔ یہاں اعیان اور علیزہ گھر پر اکیلے پریشان ہو رہے تھے۔ وہاں فرحان ڈاکٹر سے ملنے پر معلوم ہوا کہ والد خطرے سے باہر ہیں۔ جب اطمنان ہوا تو گھر والوں نے کہا وہاں علیزہ اور اعیان پریشان ہوتے ہوں گے۔ اس درمیان یہ خیال نہیں آیا کہ علیزہ کو اکیلا چھوڑ کر آیا ہوں اور وہ بھی اعیان کے ہوتے ہوئے۔ اسے راستے میں عجیب عجیب خیالات آتے رہے کیوں کہ وہ شکی مزاج کا تھا۔ لیکن یہاں اعیان کا بائیک سے ایکسیڈینٹ ہونے پر اسے چند لوگوں نے گھر پہنچا دیا۔ اعیان کو زخم بھری حالت میں دیکھ کر علیزہ اور بھی گھبرا گئی۔ اسے جلدی جلد بستر پہ لٹا کر اس کے زخموں کو مرہم پٹی کرنے لگتی ہے۔ کہ اس کے بدن میں جگہ جگہ چوٹیں

آئی تھیں۔وہ اعیان پر جھکی ہوئی تھی۔اتنے میں فرحان گھر میں داخل ہوتا ہے۔اور دیر تک دونوں کو لگا تار جلتی ہوئی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔اسے دونوں برہنہ نظر آرہے تھے۔اس نے غصے سے آگے بڑھا اور پیچھے سے علیزہ کے بالوں کو مٹھیوں سے پکڑ کر ایک زوردار تھپڑ مارا۔اور اس نے کچھ سوچا نہ سمجھا ایک جھٹکے سے کہہ دیا:

''بد بخت عورت! میں تجھے طلاق دیتا ہوں۔۔۔طلاق طلاق طلاق۔۔۔۔''[۲]

علیزہ نے یہ الفاظ سنتے ہی وہ بے ہوش ہوگئی۔اور پھر ایک پل میں دنیا علیزہ کے ساتھ ساتھ فرحان مرزا کی بھی اجڑ گئی۔ فرحان نے سچائی جانے بغیر اس کو طلاق دے دیا۔جب پتہ چلا تو اپنے بال اپنی مٹھیوں میں جکڑ کر کھینچ رہا تھا۔لیکن اعیان تو اپنے دیوان پر بیٹھا ہوا کبھی علیزہ کو دیکھتا تو کبھی فرحان مرزا کو تڑپتے ہوئے۔طلاق ہو جانے کے بعد فرحان مرزا کا گھر تین زندہ انسانوں کا قبرستان بن گیا۔اس نے طلاق کہہ کر اپنی کشتی خود ڈبو دی تھی۔اپنی وفادار بیوی کو کھو چکا تھا۔وہ پھر علیزہ کو دبارہ واپس زندگی میں پانا چاہتا تھا۔لیکن حلالہ کے سوا کوئی دوسرا راستہ فرحان مرزا کے پاس نہیں تھا۔اعیان مرزا حالات کے آگے سر جھکا کر حلالہ کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔عدت گذرنے کے بعد اعیان مرزا بھی علیزہ سے شادی اور صحبت کے بعد طلاق دیتا ہے۔علیزہ کی سب سے قریبی دوست ڈاکٹر تانیہ نے اس کی حقیقت سے واقف ہو کر اسے اپنے گھر لے چلتی ہے ۔دونوں بھائی عدت ختم ہونے کے کا انتظار بڑی بے صبری سے کرتے ہیں۔اسی دوران تانیہ سے فون پر پتہ چلتا ہے کہ علیزہ ماں بننے والی ہے۔فرحان مرزا کے پورے جسم میں زلزلہ آ گیا۔لیکن یہاں اعیان کی کیفیت خوشی میں تار تار ہو رہی تھی۔کہ وہ باپ بننے والا ہے۔تانیہ نے اس خوشی میں ایک پارٹی بھی رکھی اس میں فرحان مرزا اور اعیان دونوں کو بلایا گیا۔دونوں اس پارٹی میں برابر شریک تھے۔پارٹی ختم ہونے کے بعد جب دونوں علیزہ کے پاس جانے کے لیے بڑھے تو تانیہ سے فوراً روک دیا۔اور کہا اب تم دونوں کا اس پر کوئی حق نہیں ہے۔اعیان نے کہا یہ میری بچی مجھے دیجیے۔تانیہ نے یہ کہا کہ تم دونوں میں یہ بچی کسی کی نہیں کہہ کر فائل آگے بڑھا دیا۔یہاں میں اس ناول کا اقتباس کو درج کروں تو بہتر ہوگا:

''اعیان ہیبت زدہ آنکھوں سے اس فائل کو دیکھ رہا تھا مگر اب وہاں کوئی الفاظ کی کوئی تحریر نہیں تھی۔سب کچھ ایسا کالا ہو رہا تھا جیسے کسی نے اپنی آنکھوں میں بھرے

کاجل کورے کاغذ سے پونچھ کر پھینک دیا ہو۔فرحان کسی بت کی مانند کھڑا تھا۔اور اعیان کو اپنا وجود سوا نیزے پر آئے سورج کے نیچے اڑتے ہوئے روئی کے گالے جیسا محسوس ہو رہا تھا۔ڈاکٹر تانیہ کے لفظوں کی بازگشت انہیں سنائی دے رہی تھی۔کتنی آسانی سے ڈاکٹر تانیہ نے کہہ دیا کہ عورت شطرنج کے کھیل کی گوٹ نہیں جسے مرد جیسا چاہے اور جچا ہے اپنے حساب سے،اپنی بساط پر کھیل لے۔اس نے یہ کہہ دیا بچی اعیان کے اسپرم کی دین نہیں آپ دونوں میں سے کوئی اس بچی کا دعوے دار نہیں کیونکہ یہ ٹسٹ ٹیوب بے بی ہے''۔ے

تانیہ کی باتیں سن کر دونوں منہ لٹکائے واپس گھر چلے جاتے ہیں۔لیکن کہانی کا اختتام یہیں نہیں ہوتا۔یہ کہانی تب مکمل ہوتی ہے جب علیزہ اپنا گھر بناتی ہے اور وہ اپنے اندر کے جہاں کو ڈھونڈتی ہے،جب خود کو پہچانتی ہے تو اس کا رول کیا ہوگا؟ کہتے ہیں کہ جب انسان خود کو قیدی کی طرح محسوس کرتا ہے تو اس میں آزاد ہونے کی ایک تحریک اٹھتی ہے۔یہی تحریک انسان میں ایک نیا شعور اور ایک نیا انقلاب پیدا کرتی ہے۔یہی حال علیزہ کا بھی ہوتا ہے۔یہ اقتباس دیکھیے:

''میں اس وقت اس سے کہنا چاہتی تھی کہ ہاں میں مرد کے بغیر زندگی گذار سکتی ہوں کیونکہ اکثر شادی کے بعد معاہدے میں جو جیتتا ہے وہ مرد ہوتا ہے۔اور وہ اپنی جیت کو عمر بھر کیش کرتا رہتا ہے اور جو ہارتی ہے وہ عورت ہوتی ہے۔مرد اسے سمجھا دیتا ہے کہ اس کے ہار میں ہی اس کی جیت ہے۔گھٹنے ٹیکنے میں ہی اس کی بڑھائی ہے۔مرد کے آگے اس کی خود سپردگی اس کی زندگی کی معراج ہے۔عورت کو اپنی کانچ کی وہ نلی توڑ دینا چاہیے جس میں اس نے خودداری اور انا کے بیج چھپا کر رکھے ہیں۔جہاں تک جسم کی بات ہے تو وہ طوفانی ہے۔آج نہیں کل مٹی کا ہے مٹی میں مل جائے گا۔ایسی بے مصرف مٹی کو مرد کے تلوے کے نیچے پڑی رہنا چاہیے۔کیونکہ انہیں تلووں کی عظمت سے مستقل ہو کر ایک دن جنت عورت کے پیروں کے نیچے

آ جائے گی۔ میں بھی ایک مکمل عورت بن کر جنت پاؤں کے نیچے لانا چاہتی تھی۔ مگر
اس چاہت نے مجھے دوزخ کی زندگی دی اور میں دوبارہ کسی بھی قیمت پر اس
دوزخ میں نہیں جاؤں گی''۔[۸]

علیزہ کی اس بات سے ڈاکٹر تانیہ خوش ہوتی ہے جو ایک بزدل علیزہ سے ایک مضبوط علیزہ کو دیکھ کر بے پناہ مسرتوں کا شکار ہوتی ہے۔ اور کہتی ہے:

''شاباش علیزہ! یہ ہوئی نا بات جب تک گھاٹے کا سودا کرتی رہو گی، نقصان اٹھاتی رہو
گی، زندگی دلسے جی جاتی ہے مگر زندگی کے فیصلے ذہن سے کیے جاتے ہیں۔ اب تک تم
نے دل کی مانی ہے اور ایک فیصلہ ذہن سے بھی تو کر کے دیکھو''۔[۹]

ناول نادیدہ بہاروں کے نشاں شروع سے آخر تک ناول کا قصہ واقعات کے ایک مضبوط تسلسل پر قائم ہے۔ اس ناول میں کوئی بھی واقعہ فضول اور غیر دلچسپ نہیں ہے۔ ہر واقعہ قاری کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ کہنے کو تو ناول کی کہانی کبھی فلیش بیک میں کبھی شعور کی رو میں گذرتی جاتی ہے لیکن ہر واقعہ علیزہ میں کبھی ماں کے انتقال کا غم تو کبھی شوہر سے خوف زدہ نظر آتا ہے۔ ناول نگار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں جس طریقہ سے عورت کی زبان اور اس کے اندازِ بیان کو تراشا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس ناول میں ہر واقعہ قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ کیا واقعی خوف سے جڑی ہوئی عورت زندگی میں آگے چل کر ایسا قدم اُٹھا بھی سکتی ہے۔ جو کوئی مرد نہیں اٹھا سکتا۔

پلاٹ:

ناول کا پلاٹ سادہ اور مربوط و منظّم ہے۔ پوری کہانی پڑھ لیجیئے کہیں بھی جھول کا احساس نہیں ہوتا۔ مگر تجسس آخری دم تک بر قرار رہتا ہے۔ دراصل کہانی کا پلاٹ ماضی اور حال کے درمیان میں تشکیل پاتا ہے۔ یہ ناول میں کہانی شروع سے ہی فلیش بیک پہ چلتی ہے۔ لیکن پھر بھی پلاٹ سیدہ سادہ سپاٹ نظر آتا ہے۔ اس کا پلاٹ جیسا جیسا بڑھتا جائے گا ہم کو عورت کا درد اس کی ناکام ازدواجی زندگی کی کئی صورتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس ناول میں پلاٹ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہاں

مظلوم وکمزورعورت سے ایک مضبوط عورت بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ جوصدیوں سے عورت پر ہوتے ہوئے ظلم کے خلاف ایک قدم ہے جومظالم مردوں کے خلاف اُٹھایا گیا۔ یہاں عورت اپنے مسائل اور پریشانیوں میں جکڑی ہوئی ہونے کے باوجود ایک بہادرعورت کا کردارادا کرتی ہے۔اس کہانی میں عورت، مرد کی اس غلط فہمی کو دور کرنا چاہتی ہے کہ وہ غیر ضروری طور پر جوخود کو بہادر سمجھتا ہے۔اقتباس دیکھئے:۔

''میں فیصلہ لے چکی ہوں تانیہ۔مرد شاید اسی لیے خود کو عظیم سمجھتے ہیں کہ وہ عورت کو ماں بننے کا رتبہ دلواتے ہیں۔مگر میں مرد کی صحبت کے بغیر ماں بننا چاہتی ہوں۔جینے کے لیے کوئی تو سہارا چاہیئے نا۔''[۱۰]

ناول کے اس اقتباس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عورت جب اپنے آپ کو پہچانتی ہے اور اپنی شناخت خود بناتی ہے تو نئی صدی کی نئی عورت نئے معاشرے کی تخلیق کرتی ہے۔

پلاٹ کی تشکیل میں شائستہ فاخری نے بڑی فنکارانہ ہنرمندی سے کام لیا ہے۔جس کا ارتقاء بے حد فطری اور منظّم رنگ میں رنگا ہوا ہے۔اس ناول کے ارتقاء میں خواب کی تکنیک کو برتا گیا ہے۔جس کی وجہ سے کہانی ماضی کی زندگی کی طرف لے چلتی ہے۔ایک اقتباس ملاحظہ:

''اُف کتنا خوف ناک خواب تھا! سوچتے ہی اس کے جسم میں رونگٹے کھڑے ہو گئے۔اس نے گہری سانس لی، کچھ راحت لی، دو چار پلکیں جھپکائیں، خود کو نارمل کرنے کرنے کی کوشش کی مگر آنکھوں کے سامنے بار بار وہ منظر آجاتا جس میں اس نے دو مردوں کے آگے خود کو برہنہ کیا تھا۔لیکن وہ دونوں مرد اس کے اپنے ہی تھے اور وہ بھی عریاں تھے''۔[۱۱]

شائستہ فاخری نے ناول کے شروع ہی سے قاری کو اپنی طرف متوجہ کرلیا ہے کہ اب کیا ہونے والا ہے اور اب کیا ہوسکتا ہے؟ لیکن کہانی کے آخر تک پتہ نہیں چلتا کہ ایک نئی عورت کا روپ ہمارے سامنے آئے گا۔یہ اس ناول کے پلاٹ کی سب سے

خوبی اور کامیابی کا راز ہے۔

ناول کا پلاٹ روایتی انداز میں ہوتا ہوا بھی اپنی ایک الگ شناخت رکھتا ہے۔اس ناول میں جو کہانی بیان کی گئی ہے وہ اب تک کسی دوسرے ناول میں پیش نہیں کی گئی ہے۔ پلاٹ چار حصوں میں تقسیم ہے۔ایک ایک حصے میں عورت اپنی ایک الگ الگ شناخت بناتی ہے۔لیکن چوتھا حصہ مرکزی کردار علیزہ کی زبانی پیش کیا گیا ہے۔

پلاٹ کی خوبصورت تکمیل کی اہم وجہہ یہ ہے کہ واقعات کی ترتیب کے ساتھ ساتھ پلاٹ میں عصری صداقتوں کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے یہ ناول زندگی کی حقیقتوں کو پیش کرتا ہے جس میں انسان مکمل طور پر سماج و معاشرے سے وابستہ نظر آتا ہے۔کہیں مذہب کا دعوے دار ہے تو کہیں معاشرے کا۔

کردار نگاری:

ناول میں کہانی کے ساتھ ساتھ کرداروں کا ہونا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ بغیر کردار کے کہانی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ناول نگار کو چاہیے کہ وہ انسانی زندگی اور اس سے تعلق رکھنے والے کرداروں کے ذریعہ ایسے واقعات کا بیان کرے جو اس نے قریب سے دیکھا ہو۔ کیونکہ تجربات اور مشاہدات ہی فن کو قوت بخشتے ہیں۔لیکن یہاں شائستہ فاخری پوری طرح سے کامیاب ہیں۔وہ کردار اپنے آس پاس ہی سے لیتے ہیں۔ پروفیسر مغنی تبسم نے شائستہ فاخری کی کردار نگاری پر اپنا اظہارِ خیال یوں کیا ہے:

> ''شائستہ فاخری کی فن کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ کردار و واقعات کا اپنے آس پاس کے ماحول سے انتخاب کرتی ہیں۔اور خاصی فنکارانہ نزاکت اور چابکدستی کے ساتھ اپنے کردار کے نفسیاتی، جنسی اور سماجی مسائل کا تجزیہ کرتی ہے''۔۱۲؎

اس سلسلے میں شائستہ فاخری خود کہتی ہیں

''ہاں یہ سچ ہے کہ میں کہانیاں اپنے اردگرد سے اُٹھاتی ہوں۔کرداروں کی کوئی کمی نہیں رہتی۔سب ہمارے آس پاس ہی رہتے ہیں''۔۱۳

ناول میں دوطرح کے کردار ہوتے ہیں۔ایک مرکزی اور دوسرا ضمنی کردار۔لیکن کہانی مرکزی کرداروں کے اردگرد ہی گھومتی ہے۔ضمنی کردار وقتی طور پر کہانی کو آگے بڑھانے میں مدد دیتے ہیں۔اس ناول کے کردار مختلف طرح کے مختلف نفسیاتی طور پر پر اثر کرتے ہیں۔جو تقریباً زندگی کی حقیقتوں کو اجاگر کرتے ہیں۔ناول کے کرداروں میں خامیاں اور خوبیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

اس ناول میں مرکزی کردار علیزہ،فرحان مرزا،اعیان مرزا،اور تانیہ ماتھر۔ناول کا بیشتر حصہ انہیں کے اردگرد گھومتا ہے۔ناول کے پہلے حصے میں علیزہ ایک مضبوط عورت کے روپ میں نظر آتی ہے۔کیونکہ وہ اپنے بیتے ہوئے کل کو چھوڑ کر اپنی زندگی میں آگے بڑھ چکی ہوتی ہے۔وہ اپنے بیتے ہوئے کل کو خواب میں دیکھا تو ہمارے سامنے ایک یتیم لڑکی جس کی ماں کا انتقال،اور ایک مجبور و مظلوم عورت جس پر شوہر کا بے وجہ شک جو ایک طلاق شدہ عورت جس کا شوہر کچھ سوچے سمجھے بغیر طلاق دے دیا ہو۔آگے چل کر علیزہ پر آنے والی مصیبتوں کو ہر روپ میں سامنا کریں گے۔علیزہ کی شادی اپنی ماں کے انتقال کے بعد فرحان مرزا سے ہوتی ہے۔اس وقت اس کی عمر بہت چھوٹی تھی۔اور وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ کیسے برتاؤ کریں۔مگر پھر بھی شوہر کا ہر طرح سے خیال رکھتی تھی۔یہ دونوں آپس میں ایک دوسرے سے برابر کی محبت کرتے تھے۔علیزہ کے ذہن میں فرحان کے سوا کسی اور کے لیے جگہ نہیں تھی۔اقتباس دیکھئے:۔

''خبردار تنو!ایسے الفاظ دوبارہ نہ کہنا۔فرحان میرا شوہر ہے اور اعیاں میرا پیارا دیور۔۔۔۔بس اور کچھ نہیں''۔۱۴

شائستہ فاخری نے نفسیاتی کشمکش کی وضاحت جس انداز سے کرتی ہیں وہ اپنی مثال آپ ہے۔اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:ایک روز علیزہ،فرحان،اعیان اور بلقیس فلم ہال چلتے ہیں۔اعیان مرزا کا علیزہ کے پہلو میں بیٹھنا فرحان مرزا کو گوارہ نہیں ہوتا۔لیکن علیزہ بھی اس پر غور نہیں کی ہوتی کیونکہ علیزہ کو شادی ہوئے ابھی کچھ ہی دن تھے۔وہ کسی مرد کی نفسیات سے واقف نہیں تھی فلم دیکھنے کے بعد سب گھر جاتے ہیں۔لیکن فرحان علیزہ سے اکھڑا ہوا تھا۔لیکن علیزہ اس کے مزاج سے واقف نہیں تھی۔علیزہ کے پوچھنے پر فرحان نے جواب دیا:

''اب مجھ سے کیا کیا چاہتی ہے، یہ پیاس بھی جا کر اعیان سے ہی بجھوا لے، بے شرم عورت اندھیرے میں اعیان کے بغل میں پکچر دیکھتے ہوئے تجھے غیرت نہیں آئی۔''۱۵

نادان علیزہ فرحان کے غصے سے بے قابو ہوگئی۔اس کو پتہ نہیں چلتا کہ فرحان اس پر شک کرے گا۔کیونکہ مرد کی نفسیات سے واقف نہیں تھی۔اس لیے اسے دونوں کے بیچ بیٹھنے میں تکلف نہیں ہوا۔یہاں علیزہ سوچتی ہے:

''کتنا آسان ہوتا ہے عورت کا عورت سمجھ لینا، اور کتنا مشکل ہوتا ہے ایک عورت کا مرد کو سمجھ نا، کتنا بوسیدہ ہے عورت اور مرد کو ملانے والا وہ پل جو کسی ہوائی جھولے کی طرح لمحہ لمحہ دل کو ہلاتا رہتا ہے کہ کب کون سا سرا ٹوٹے اور کب وہ جھولا ہوا کی زد کا شکار ہو جائے''۔۱۶

اس ناول میں جذباتی اور نفسیاتی کشمکش کی سیکڑوں مثالیں ملتی ہیں۔یہاں علیزہ کا کردار مضبوط ہوتا جاتا ہے۔علیزہ ایک بدریج ارتقائی عمل سے گذرتی ہوئی ایک جاندار، اور مضبوط روپ اختیار کر لیتی ہے۔علیزہ زندگی کے ہر موڑ کا سامنا کرتی ہوئی ہمیں ایک بے بس عورت کے روپ میں جگہ جگہ نظر آتی ہے:

''علیزہ کے لیے اب سوچنے کو بچا ہی کیا تھا۔وہ تو اب اس قابل بھی نہیں بچی تھی کہ اپنی ہی موت کی تعزیت کر پاتی۔شدید صدمے جب حد سے گزرتے ہیں تو جیسے تکلیف پہنچانے کی اپنی قوت بھی کھو دیتے ہیں۔ہر کمال را زوال۔انتہا ایک نئی پیشین گوئی ہوتی ہے جو انسان کے زخمی احساسات کے لیے مرحم ہوتی ہے''۔۱۷

علیزہ پر ہونے والے مظالم کی یہ تصویر دیکھیے:

''میں اور اعیان۔۔۔بند دروازے پر چپکی دو خوف ناک آنکھیں جو آج بھی

میرے جسم میں کانٹے کی طرح چبھتی ہیں۔ایک نے میری روح کو زخمی کیا تو
دوسرے میں نے زندگی تلاش کرنی چاہی مگر دوسرا۔۔۔دوسرا تو پہلے سے لجلجا،غلیظ
کیڑا نکلا جس نے میری سوچ کو تار تار کر دیا۔میں اپنے لیے ایک بوجھ بن گئی''۔۱۸

علیزہ اپنے اندر کتنا درد وغم سہتی رہی کوئی اپنا نظر آ رہا تھا نہ ہی ماں باپ جن کو اپنا غم سنائیں۔آخر کار علیزہ ان دونوں مردوں کے مظالم اس رویہ سے مجبور ہوگئی۔ایسی حالت میں اس کا کوئی اپنا ہے تو وہ صرف ڈاکٹر تانیہ تھی۔جو ہر حال میں اس کا ساتھ دیتی تھی۔اقتباس دیکھیے:

''میں آخری بار تانیہ کے گلے لگ کر اپنے جسم میں قید سارے آنسوؤں کو نکال لینا
چاہتی تھی۔۔۔میری آنکھیں اشک بار تھیں تانیہ شاید ان لمحوں کے درد سے واقف
تھی۔اس نے قریب کیا اور میری آنکھیں بارش کا موسم بن گئے۔میں دیر تک تانیہ
کی آغوش میں پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔پھر اچانک جھٹکے سے میں الگ
ہوئی''۔۱۹

اس ناول میں ایک اہم کردار فرحان مرزا جو علیزہ کا شوہر ہے۔اس کردار میں چند خوبیاں اور خامیاں بھی ہیں۔کہیں اپنی بیوی سے محبت ہے تو اسی جگہ جھگڑا اور اکڑ پن نظر آتا ہے۔فرحان مرزا کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی بیوی سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''علیزہ! میرے ساتھ کبھی دغا مت کرنا تمہارا جسم میرا ہے،تمہارے خیالات
میرے ہیں،تمہاری فکر میری ہے،تمہارا وجود الگ سے کچھ نہیں ہے،تم میرے وجود
کا ہی ایک حصہ ہو''۔۲۰

وہیں فرحان کا دوسرا روپ بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔اس میں سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ کسی بات پر کیا جانے والا شدید ردِعمل ۔۔۔وہ بہت جلد غصے میں حدیں پار کرتا تھا پھر جب ٹھنڈا پڑتا تو معافی مانگتا تھا۔فرحان کا اندازِ کلام دیکھیے:

''وہ انتظار کرتے جا چکا ہے۔تمہیں تو ہنسی مذاق کرنے سے فرصت ہی نہیں، وقت پر کوئی کام تم سے نہیں ہوتا دماغ بھٹکا رہتا ہے۔میری بات کا تو تمہیں دھیان رہتا ہی نہیں، میں بکتا ہوں تو بکتا رہوں تمہیں تو وہی کرنا ہے''۲۱

اعیان بھی اس ناول کا ایک جاندار کردار ہے۔اس ناول میں اس کے دو روپ دکھائی دیتے ہیں۔ پہلے دیور تھا تو بہت ہی خوش مزاج انسان تھا۔ جب علیزہ کا شوہر بنا تو اس کا دوسرا روپ نظر آتا ہے۔اعیان کا کردار یہاں مثبت رویہ کا مظہر ہے۔علیزہ اپنے دل میں سوچتی ہے:

''اعیان کی شخصیت فرحان سے کافی جدا تھی۔وہ بہت ٹھہر ٹھہر کر سنجیدگی سے باتیں کرتا تھا۔ ہر ایک کے مسئلے پر خوب غور و فکر کر کے انجام تک پہنچتا تھا۔کم گو اور بہت حد تک دوسروں سے محاط رہنے والا شخص تھا''۔۲۲

اعیان کے کردار میں سادگی و نفاست شامل تھی۔ وہ بڑوں کی عزت کرتا تھا۔اس کی ماں ہندو ہونے کے باوجود اس کا رویہ لوگوں سے مثبت طریقے سے تھا۔اعیان کی گفتگو کو دیکھیے :

''پریشان مت ہوئیے بھابی میں نے بوا سے کہہ کر آپ دونوں کا کھانا پیک کوایا ہے۔ڈرائیور گاڑی پر آپ دونوں کا انتظار کر رہا ہے۔کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں''۔۲۳

ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

''بھابی یہ مت بھولیے کہ وہ میرے بڑے بھائی ہیں۔میں ان کو آپ سے زیادہ جانتا ہوں۔گھر جائیے،خوش رہیے،ٹی۔وی دیکھیے یا پھر آرام کیجیے''۔۲۴

اعیان میں سادگی،ملنساری، ہمدردی کا جذبہ کوٹ کوٹ بھرا ہوا تھا وہ چھوٹے بڑوں سے محبت سے پیش آتا تھا۔فرحان کا سلوک اس پر اچھا نہ ہونے کے باوجود وہ اپنے بھائی سے والہانہ محبت کرتا تھا۔اس طرح سے اعیان کا دوسرا روپ بھی دیکھنے

کو ملتا ہے کہ کتنا خوش مزاج انسان آگے چل کر اپنی بیوی یعنی علیزہ کے ساتھ کتنا گھناؤنا برتاؤ کرتا ہے۔ جہاں اس میں خوبی تھی وہیں بدمزاجی بھی پل رہی تھی۔علیزہ سے شادی کرنے کے بعد انہوں نے جسمانی طور پر بڑی تکلیف دی تھی۔اس اقتباس کو دیکھیے :

''اس رات اس نے علیزہ کا بے دردی سے استعمال کیا تھا۔اس نے پورے بدن میں جو آگ لگی تھی وہ ہوس کی نہیں تھی بلکہ ایک ناگفتہ بہ غصہ تھا جو فرحان کی دین تھا۔اس پر اس رات اسی غصے نے ایسی غضب ناکی اختیار کر لی تھی کہ اسے اس کا احساس ہی نہیں ہوسکا کہ وہ محض ایک فریضے کی ادائیگی کے لیے یہ عمل کر رہا ہے۔۔۔اس رات جب علیزہ تڑپ کر اس کے چنگل سے نکلنا چاہا تھا تو اعیان نے اپنی پوری مردانہ طاقت سے اسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔اور اپنی بھر پور ہتھیلی اس کے منہ پر رکھ دی تھی تا کہ کوئی آواز دروازے سے باہر نہ جانے پائے ''۔۲۵

بلآخر دوسرے مرد کی طرح اس میں بھی تبدیلی آ ہی گئی۔ جو انسان عورت کی عزت کرتا رہا وہ بھی ایک مردانہ وار روپ اختیار کر چکا تھا۔ان دونوں مردوں نے علیزہ کا بے دردی سے استعمال کیا۔لیکن ان دونوں کے آگے تانیہ کا کردار بہت جاندار ہے جو علیزہ کا ساتھ کھڑی ہوئی ہے۔تانیہ بالکل ایک ڈاکٹر کے کردار میں پوری اترتی ہے۔اور انہیں ڈانٹتی ہے۔تانیہ کا کردار یہاں دیکھیے :

''آدھے گھنٹے کے بعد جب ڈاکٹر تانیہ کمرے سے باہر نکلی تو سراپا جلال اور قہر کا مجسمہ بنی ہوئی تھی۔اس کی آنکھوں میں نفرت اور غصے کی چنگاریاں بھری ہوئی تھیں۔وہ فرحان اور اعیان کو پھٹکار رہی تھی۔ دونوں مجرم کی طرح گردن جھکائے کھڑے تھے۔اور اس نے فیصلہ سنا دیا۔علیزہ لاوارث نہیں ہے،آگے کیا ہونا ہے

بعد میں سوچا جائے گا۔ فی الحال میں علیزہ کو لے کر جا رہی ہوں۔ جب وقت آئے
گا تو علیزہ کو آپ کے سامنے لے آؤنگی''۔۲۶

ڈاکٹر تانیہ ہی تھی جو علیزہ کو اس ظلم کے شکار سے باہر نکلنے اور اسے نیا راستہ ڈھونڈنے میں مدد دیتی ہے۔ اگر اس کہانی میں دیکھا جائے تو علیزہ کا کوئی اپنا ہو تو وہ صرف ڈاکٹر تانیہ تھی جو علیزہ کی سچی دوست تھی۔ اہی علیزہ کا سہارا بنی۔ جس نے علیزہ میں ایک مضبوط عورت کو اجاگر کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ تانیہ ڈاکٹر ہونے کے ناتے علیزہ جیسی عورت میں ٹسٹ ٹیوب بے بی کے ذریعہ اس کے جینے کا سہارا دیا۔

اس کے علاوہ ناول میں اور بھی ضمنی کردار ہیں جو کہانی کو آگے بڑھانے میں مدد دیتے ہیں۔ جیسے بلقیس (نند)، ابی (سسر) قدسیہ جیسے وغیرہ۔ یہاں بلقیس کا کردار بھی مثبت کردار تھا۔ وہ اپنی بھابی کی عزت کرتی تھی۔ کیونکہ اس عمر میں صرف چار سال کی بڑی تھی۔ چونکہ وہ اس سے پہلے علیزہ کو دو تین بار مل چکی تھی۔ اس کی وجہ سے علیزہ کافی حد تک مانوس تھی۔ مرزا گھرانے کے سبھی لوگ خوش مزاج اور انسانیت کے مالک تھے۔ علیزہ اس گھرانے سے کافی خوش تھی۔ سب لوگ اس کی عزت کرتے تھے۔ یہاں تک فرحان کی امی بھی اپنی بہو سے بہت خوش تھی۔ کسی بات پر فرحان علیزہ چلاتا تو امی اس کو ڈانٹتی تھی۔

''بیٹے فرحان! دھیمی آواز میں بولا کرو، شریف گھروں میں آوازیں چہار دیواری سے باہر نہیں جاتیں''۔۲۷

اس ناول کے کرداروں میں علیزہ، فرحان مرزا، اعیان مرزا، ڈاکٹر تانیہ، بلقیس، ابی، فرحان کی امی، قدسیہ، انجلی، راحت چچا، اور ڈاکٹر عسکری ہیں۔

ناول میں جتنے مرد کردار ہیں ان سب میں ایک بات مشترک ہے۔ تمام مرد کردار عورت کو اپنے پاؤں کی جوتی سمجھتے ہیں۔ اور عورت ان کے مظالم کی شکل نظر آتی ہے۔ اس کے ضمنی کردار بھی عورت کے خلاف ہیں۔ مثلاً راحت چچا کا ایک مکالمہ ملاحظہ ہو:

''عورتیں تو مردوں کے پیر کی جوتیاں ہوتی ہیں۔ یہ تو ہم شاعروں نے تخیل میں

انہیں چڑھا چڑھا کر سر پر بٹھا لیا ہے۔اب موتیں گی تو منہ پر نہ آئے گا تو کہاں آئے گا''۔۲۸؎

شائستہ فاخری کی کردار نگاری میں یہ خامی دکھائی دیتی ہے کہ ان کے تمام کردار ظالم ہیں اور اس معاملے میں سب یکساں ہیں اور یہ بات فطرت کے خلاف ہے۔

**مکالمہ نگاری:**

مکالمہ نگاری بھی ناول کا ایک اہم عنصر ہے۔ناول کی کامیابی میں مکالمہ نگاری کا ایک اہم رول ہوتا ہے۔مکالمہ وہ ہے جس کے ذریعہ کہانی آگے بڑھتی ہے۔اور مکالمے کے ذریعہ ہی ہم کردار کی نفسیات و جذبات سے واقف ہوتے ہیں۔اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ ناول میں کوئی بھی مکالمہ اپنے کردار کے رویہ سے الگ نہیں۔جیسا کردار ہے ویسی ہی گفتگو بھی ہے۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ کس کی حیثیت کیا ہے۔ناول میں علیزہ اور فرحان کے درمیان کی گفتگو اس کی بہترین مثال ہے۔جس سے فرحان کی ذہنیت صاف طور پر نظر آتی ہے۔

''علیزہ! میرے ساتھ کبھی دغا مت کرنا تمہارا جسم میرا ہے،تمہارے خیالات میرے ہیں،تمہاری فکر میری ہے،تمہارا وجود الگ سے کچھ نہیں ہے،تم میرے وجود کا ہی ایک حصہ ہو''

علیزہ نے بھی پیار سے اس کا ساتھ دیا۔

'' پگلے! میں مکمل طور پر تمہاری ہوں۔جسم و جاں،دل و دماغ سب کچھ بغیر تقسیم کیے تمہاری ہی رہونگی۔

''میرے سر پہ ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ''

''کیا بچپنا کر رہے ہو۔یہ دنیا اپنا گھر نہیں ہے پبلیک پلیس ہے۔پکچر ہال میں بیٹھ کر میں تمہارے ہاتھ پر سر رکھ کے قسم کھاؤں گی تو تماشا بنے گا۔اور پھر قسم کھانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔میرے قول پر کیا تمہیں بھروسہ نہیں؟''

''میں کہتا ہوں میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ مجھے تم پر بھروسہ ہے لیکن دوسروں پر جو ہماری ارد گرد رہتے ہیں''

کیا بکواس کرتے ہو فرحان،تم یہ کہ میری توہین کر رہے ہو''

''بس بہت سمجھ چکا''

فرحان تیزی سے اُٹھ کر پکچر ہال سے باہر نکل کر بائیک اسٹارٹ کرنے کے لیے کک مارنا شروع کر دیا۔

''لو میں قسم کھائی''[۲۹]

ان دونوں کی گفتگو دیکھئے کہ فرحان کا عورت پر سے بھروسہ اُٹھ رہا ہے۔اسی طرح علیزہ کی اجڑی ہوئی زندگی میں لاچار و بے بس پڑی رہی تو اس کو ہوش میں لانے کے لیے ڈاکٹر عسکری اور علیزہ کا مکالمہ دیکھیے :

ڈاکٹر عسکری نے پوچھا ''کیسی ہیں آپ''

''جیسی ہوں ٹھیک ہوں''

''کیا نام ہے آپ کا''

''عورت''

''عورت کوئی نام ہوتا ہے''

''نہیں ذات ہوتی ہے''

''آپ کو اپنی ذات کیسی لگتی ہے''

'بری'

''بری کیا! بری کیوں عورت کی ذات ایک خوبصورت شئے ہے''۔

''آپ کہاں رہتی ہیں''

''کوٹھری میں''

ان مکالموں میں کہیں کوئی جھول نہیں ہے۔

ڈاکٹر عسکری نے فرحان اور اعیان کو تلخی سے ڈانٹتے ہوئے کہا:

''ہوشیار ہو جائے ورنہ ایک عورت کے مارے جانے کا الزام آپ کے سر آ سکتا ہے''۔[۳۰]

ناول نگاری نے کرداروں کی ذہنی کیفیت، جذبات کے فطری بہاؤ کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اکثر بھائی بھائی کا دشمن ہو جاتا ہے۔ شائستہ نے اس ناول میں اس حقیقت کو بھی اجاگر کیا ہے۔ اقتباس دیکھیے :

فرحان: میں اتنی دیر سے بھوکا ہوں تو آپ نے نہیں کھلایا اور اعیان کو کھلانے لگیں''

ماں نے کہا ''بیٹا تم مردانے میں تھے، میں نے تو کھانا وہاں لگوا دیا ہے، اچھا آؤ! میں تمہیں بریانی کھلاتی ہوں'

فرحان ''میں اعیان کا جھوٹا نہیں کھاؤں گا''

ماں ''نہیں بیٹے ایسا نہیں بولتے، اعیان نے بھی تو تمہارا جھوٹھا کھایا ہے۔'

''میں تو بڑا ہوں''

''بڑے اور چھوٹے سے کیا ہوتا ہے۔ بیٹا تم دونوں بھائی بھائی ہو۔ پیار محبت سے رہا کرو''۳۱

مکالموں کے ذریعہ معاشرہ کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔ مثلاً شادی بیاہ کے طور طریقوں کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے ۔ایک مثال:

> ''قدسیہ اسے اعیان بابو! بھاوج اتر رہی ہے دس بیس سے کام نہیں چلے گا۔ پورے کے پورے اکیان لونگی۔'' اعیان! اکیان کیوں بوا؟ میں تو پورے ایک سو دونگا۔ مگر آپ بھابی کو تخت بٹھا دیجیے۔ گود میں چڑھے چڑھے ان کی سانس رک رہی ہوگی''۔۳۲

یہ محض ایک کردار کی نفسیات ہی نہیں ہے بلکہ سماج کے رسوم کا بھی آئینہ دار ہے۔

منظر نگاری:

کہانی چاہے درد بھری ہو یا خوشی کی، کہانی جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے منظر بھی ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ناول نگار وہی کامیاب ہوتا ہے جو حالات و کردار کے اعتبار سے منظر کشی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس لحاظ سے شائستہ فاخری کامیاب ہیں۔ انہوں نے ناول میں منظر نگاری کے لیے عورت کی بدحالی کے بڑے خوبصورت اور عمدہ نمونے پیش کیے ہیں۔

شائستہ فاخری نے کہانی میں کسی واقعے یا حادثہ کی ہو بہو تصویر کشی کی ہے۔اس ناول میں پیکر تراشی کی بیسیو مثالیں ایسی ہیں جن سے منظر آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگتے ہیں۔مثلاً:

''اچانک دروازے پر تیز دستک ہوئی ۔کہیں دور بجلی کڑک کر گری اور زور دار دھماکے کی آواز آئی۔خیالات کے جنگل میں بھٹکتی علیزہ جیسے یکدم ہوش میں آ گئی۔ارے اس کا جسم کپڑوں سے کب جدا ہو گیا؟ اور کب وہ فرحان کے برہنہ جسم کے نیچے آ گئی،اس کا اسے احساس ہی نہیں ہوا۔دماغ اور جسم میں آپس میں الگ تھلک پڑ گئے تھے''۔۳۳؎

شائستہ فاخری اگر چاہتیں تو بے شمار ایسی فحش تصویریں ناول میں سجا سکتی تھیں۔لیکن ان کے یہاں جنسی لذت سے زیادہ عورت کے دکھ درد،جھلکتے آنسو،دردناک کراہیں،ٹوٹتا بدن،اور خود سپردگی کے بجائے مجبوری و بے بسی دکھائی دیتی ہے۔ یہ اقتباس دیکھئے:۔

''ستاروں سے بھرا گہرا نیلا آسمان رنگ بدل رہا تھا۔چپکے چپکے سیاہی ڈوبتی جا رہی تھی۔اور اجلی اجلی سفیدی صبح صادق کا اعلان کر رہی تھی۔علیزہ کے قدم آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔بابل کی دہلیز ہمیشہ کے لیے پیچھے چھوڑ رہی تھی۔کاہے کو بیاہا بدیس ارے لکھیا بابل مورے،گانے کی تیز آواز علیزہ کو بے چین کیے ہوئے تھی۔یہ وہ گھڑی ہوتی ہے جبلڑکی کی ترازو کے دونوں پلڑوں پر مستقبل کے دکھ سکھ کے باٹوں کو لے کر نفع نقصان کے سودے سے انجان کمسن خوابوں کی تکمیل کے لیے ایک اجنبی کے بھروسے نئی زندگی،نئے شب و روز کے سفر پر نکل پڑتی ہے۔وہ بڑی سی سرخ چادر سے لپٹی ہوئی جس کی کناری چوڑے سنہرے کوٹے سے سجی ہوئی تھی۔بھاری لباس،بھاری زیور اور بھاری بھرکم دھوپ چھاؤں جیسے جذبات اس

کے قدموں کولڑ کھڑا رہے تھے۔تبھی کسی نے آواز دی،ارے بھائی! قرآن پاک لاؤ۔دلہن کے سر پہ سایہ کرنا ہے''۔۳۴

اس طرح فنکار نے شادی بیاہ کی منظر کشی اس انداز میں کی ہے کہ سارا منظر اپنی آنکھوں میں اتر آتا ہے۔

## جذبات نگاری:

جذبات نگاری بالعموم آرٹ کا اور بالخصوص فکشن کا ایک اہم عنصر ہے۔کامیاب اور ناکام فکشن نگار کے درمیان ہم لکیر اس کی بنیاد پر بھی کھینچ سکتے ہیں۔کامیاب فکشن نگار بڑی عمدگی کے ساتھ جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔جبکہ ناکام فکشن نگار جذبات نگاری میں سطحیت یا بھونڈے کو اختیار کرتا ہے۔شائستہ فاخری میری نظر میں کامیاب فکشن نگار ہیں کہ انھوں نے موثر انداز میں جذبات نگاری کی ہے۔مثلاً ایک اقتباس ملاحظہ ہوں:

''علیزہ کو پہلی بار احساس ہوا کہ ایک بھرے پرے گھر میں جا رہی ہے۔ہلکا سا خوشگوار شور اٹھا،دلہن آ گئی کیا آوازیں علیزہ کے کانوں میں پڑی۔اس کے ہونٹوں پر تھکان سی بھری ہوئی مسکراہٹ پھیل گئی۔نکاح کے تین بول سے لڑکی پل میں اپنی شخصیت کتنا باوقار سمجھنے لگتی ہے۔لڑکپن ایک دسخط کے ساتھ ہی کئی بھی چھلانگ لگایا جاتا ہے۔ابھی تو اسے اپنے شوہر کے ساتھ چند گھڑیاں تنہائی میں گزارنے کو نہیں ملی تھیں مگر وہ خود کو کتنا بدلا بدلا محسوس کر رہی تھی۔اب وہ علیزہ مرزا بن چکی تھی۔اب اس کے دکھ درد میں شامل ہونے کے لیے ایک بندہ اس کے ساتھ تھا جو صرف اس کا اپنا تھا۔خالص اس کا اپنا۔۔۔جہاں کوئی بٹوارہ نہیں۔''۳۵

جذبہ دراصل اندرونی کیفیت کا نام ہے۔شائستہ فاخری نے جذبات نگاری کے فن سے بھرپور واقفیت رکھتی ہیں۔موقع و محل کے اعتبار سے انھوں نے جذبات نگاری کا استعمال کیا ہے۔فرحان جو اپنی بیوی علیزہ سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔لیکن اس کے اندر یہ شک بھی پل رہا ہے۔کہ کہیں علیزہ اعیان کی نہ ہو جائے۔اس طرح انہوں نے کچھ سوچے سمجھے بغیر اسے طلاق

دے دیتا ہے۔ پھر اسے اپنی زندگی میں واپس لانے کے لیے حلالہ کے سوا اور راستہ نہیں ہوتا اس لیے اعیان شادی کروا دیتا ہے۔ یہاں فرحان کے جذبات کو دیکھیے :

''علیزہ تم میری ہو، صرف میری۔ اعیان تو محض ایک ذریعہ ہے تمہیں دوبارہ حاصل کرنے کا۔ خدارا تم اعیان بھنور جال میں مت الجھنا۔ اعیان کے لیے تو دنیا پڑی ہے، مگر میری دنیا تم پر ہی ختم ہے''۔[۳۶]

شائستہ فاخری نے کہیں کہیں جذبات نگاری کرتے ہوئے شاعرانہ انداز میں بھی واقع ہیں۔ جو ایک عورت کی زبانی اقتباس دیکھئے:

''میں اداسی نہیں تھی
لیکن صدیوں کا کرب بھوگتی رہی میں
میں پرتھاؤں میں جلی
میں خواہشوں میں ستی ہوئی
رسیاں پھاندنے کی عمر میں
میری رسیاں ہی جل گئیں
زمین پر لکیریں کھینچتے ہوئے آنکھیں موند کر گوٹ پھیکتے ہوئے
مٹی کی گوٹ ٹوٹ گئی
بستر پر بجھے ہوئے انگارے تھے
اور ماں باپ کی آنکھوں میں کسی طرح مجھے گھر سے کسی اور گھر بھیج دینے کی ارمان
میں دمینتی تھی، سیتا یا رادھا یا خدیجہ
میں ربر کی ایک پچکی ہوئی گیند تھی

اوراس گیند سے کھیلنے والے تماشائی‘‘ ۳۷؎

دومردوں نے مل کرعلیزہ کی زندگی اجاڑ دی ہے۔اسی لیے اس کی زبان سے نکلنے والا ہر لفظ قاری کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا۔ ایک اوراقتباس دیکھئے:۔

’’نہ مکان نہ گھر۔نہ کوئی چوکھٹ اپنی۔۔۔نہ کوئی جسم اپنا۔۔نہ کوئی شانہ کہ جس پر سر رکھ کر مداوا تلاش کیا جائے۔بس ایک پرائے آنگن سے دوسرے پرائے آنگن کا سفر۔ایک پرایا آنگن امی ابو کا۔۔۔جس کے در، دروازے کھڑکیوں سے بھی آشنائی کی رسم راہ نہ سکی۔۔۔ننھی ننھی منی مٹی کی گوٹ سے کھیلنے والی عمر میں سر پر یوں آنچل کا سایہ کیا گیا کہ اپنے ہی گھر کو دیکھنے والی آنکھیں بھی اندھیرے میں ڈوب گئیں۔۔۔پھر اس پر پرائے آنگن سے دوسرے پرائے آنگن تک۔۔۔فرحان مرزا سے اعیان تک۔۔ایک خونخوار جسم سے دوسرے سرد اور بے جان جسم تک۔۔

اب ایک چیخ اُٹھتی ہے۔۔۔

میں کوئی ٹھنڈی آگ نہیں تھی

لیکن مجھے سرد کیا گیا۔

جب اڑنا چاہا

سر پر آنچل کا سایہ کیا گیا

جب رومانی ہونا چاہا

مذہب کا خوف بیٹھا دیا گیا

جب رسم ورواج کے نام پر ایک جسم مجھے سونپا گیا۔۔۔

تو وہاں بھی انہیں عقیدوں کی حکومت تھی۔۔۔

اور میں۔۔کوئی ٹھنڈی آگ نہیں تھی۔۔۔

لیکن مجھے سرد کیا گیا۔۔۔۳۸؎

ان خیالوں سے یہبات ثابت ہوجاتی ہے کہ ناول میں شائستہ فاخری نے جذبات نگاری میں اپنے فق کا کمال دکھایا ہے۔

اسلوب:

ناول میں زبان و بیان کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ جو ناول کے حسن میں اضافہ کر دیتی ہے۔ ناول نگار جس کردار کو تخلیق کرتا ہے وہ ان کی زبانی مکالمے ادا کرواتا ہے۔

اس ناول میں زبان و بیان کا استعمال سیدھا سادہ ہے۔ کہیں بول چال روزمرہ کی زبان ہے تو کہیں خطیبانہ ناصحانہ وشاعرانہ انداز اور کہیں عورت کی وہ شستہ زبان جو قاری کو متاثر کرتی ہے۔ فنکار کی تحریروں میں جو سادگی و شگفتگی ہے اس سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مثال کے طور پر اردو کا روزمرہ دیکھیے:

''فرحان' میں اور علیزہ فلم دیکھنے نہیں جائیں گے۔ کیوں؟ کیونکہ مجھے راحت چچا سے ملنے جانا ہے۔ وہ علیزہ کو کئی دنوں سے یاد کر رہے ہیں،، اعیان نے کہا' بھائی ایسا کرتے ہیں فلم دیکھنے کے بعد ہم سب راحت چچا کے گھر چلتے ہیں''[۳۹]

شائستہ فاخری نے اس ناول میں کہیں کہیں مختصر مکالموں کے ذریعہ بہت عمدہ تاثر چھوڑا ہے۔ ناول کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''ڈاکٹر تانیہ نے فرحان کے رویوں سے بے نیازی برتتی ہوئی سیدھے اعیان سے ہم کلام ہوئیں۔ 'یہ بچی آپ کی ہے اس کا ثبوت کیا ہے؟''[۴۰]

ناول نگار نے کردار کے مطابق زبان کی ادائیگی خوبصورت انداز میں کی ہے۔ کسی کی زبان میں مٹھاس ہے تو کسی میں کڑواہٹ۔ شائستہ نے ماں کی زباں سے نکلتے ہوئے کلمات کو کس خوبصورتی سے پیش کیا ہے، ملاحظہ ہو:

''بیٹی! عورت کی مٹی ایسی ہوتی ہے کہ وہ صرف دوسروں کے کام آئے۔ یہ مٹی تبھی ٹھکانے لگتی ہے جب مرد اعتماد اور محبت کے ساتھ اس مٹی سے اپنا گھروندا تیار کرلے۔ تبھی عورت کی مٹی پاکیزہ کہلاتی ہے۔ ورنہ وہ دلدل میں دھنستی جاتی ہے''[۴۱]

ناول نگار کا اسلوب بڑا دلکش ہے۔ان کے اسلوب میں شاعرانہ انداز بھرپور طریقے سے نظر آتا ہے۔مثال کے طور پر:

''تمہارے احساس کی قدر کرتی ہوں۔لیکن میں گلاب نہیں ہوں۔۔۔میں اب
ان معصوم پتوں کی طرح نہیں ہونا چاہتی۔جنہیں کوئی بھی پھینک کر چلا جائے۔۴۲

شائستہ فاخری کے اسلوب میں کہیں شعری وجدان، کہیں روزمرہ کی بول چال تو کہیں ااستعاراتی انداز طرز کی زبان کا جادو نظر آتا ہے۔

گوپی چند نارنگ نے شائستہ فاخری کے اسلوب کے تعلق سے یوں اظہارِ خیال کیا ہے:

''شائستہ فاخری کے اسلوب میں ایسی پختگی اور اظہارِ بیان میں ایسی خوبیاں ہیں جو
دوسری معاصر لکھنے والیوں (دو ایک کو چھوڑ کر) میں ان کو اہم بناتی ہیں۔۴۳

اسی طرح انیس رفیع نے بھی ان کے اسلوب کے تعلق سے اپنے تاثرات پیش کیے ہیں:

''شائستہ فاخری کی سادہ اور شستہ زبان و اسلوب میں طنز و فلسفہ کی آمیزش ان کے
فن کو شناختی وصف بخشتی ہے۔کہیں کہیں شعری وجدان اور اساطیری بیانیہ کا بھی
احساس ہوتا ہے۔''۴۴

ان دونوں اقتباسات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ سادہ اور سلیس زبان میں اپنی بات کہتی ہیں۔تاہم کہیں کہیں پر تکلف زبان کا بھی استعمال ہے جو نسبتاً کم ہے۔

نقطۂ نظر:

ہر فنکار کا نقطۂ نظر ہوتا ہے۔ہر تخلیق کے پسِ پردہ کچھ راز ہوتے ہیں۔اسی طرح شائستہ فاخری بھی اپنا ایک نقطۂ نظر رکھتی ہیں۔اگر ہم ''نادیدہ بہاروں کے نشاں'' کے نقطۂ نظر کی بات کریں تو یہ صاف نظر آتا ہے کہ وہ عورت کو مرد کے حصار سے باہر نکالنا چاہتی ہیں۔وہ عورت کے وجود کو تسلیم کرتی ہیں۔عورت ان کے یہاں حاوی کردار بن کر آئی ہے۔وہ عورت جو شادی کے بعد شوہر کی جوتی بن کر جیتی ہے۔آگے چل کر عورتوں میں ایک نیا شعور جگاتی ہے۔وہ یہ ثابت کرنا

چاہتی ہے کہ عورت مرد کے بغیر جی بھی سکتی ہے۔اس کے سر پر کسی سائبان کا ہونا ضروری نہیں۔

شائستہ فاخری کے دل میں عورت کے درد وغم کو بے پناہ جگہ حاصل ہے۔اسی درد نے ایک فن کی صورت اختیار کر لی ہے۔اسے یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ ''بس! بہت ہو گیا' اب اور نہیں' یہ ظلم اب نہیں چلے گا۔اپنے حق کے لیے لڑنا ہی ہوگا۔سماج میں مرد کے برابر کھڑا ہونا ہی ہوگا۔اور ہمیں مذہب، سماج معاشرے کا خوف دلا کر ڈرایا دھمکایا نہیں جا سکتا۔یہی کہانی میں علیزہ جیسی مجبور عورت کو جنم دیا ہے۔جو دو مردوں سے تنگ آ کر وہ فیصلہ کرتی ہے۔جس سے عورت کی بہادری اجاگر ہوتی ہے۔وہ ٹسٹ ٹیوب بے بی کے ذریعہ ایک بچی پیدا کر کے اپنے جینے کا سہارا ڈھونڈتی ہے۔ناول نگار خود کہتی ہیں:

> ''جب کہیں کوئی بات اپنے اختتام کو آتی ہے تو ذہن میں ایک نئی بات کی شروعات ہوتی ہے۔جو زندگی کے آغاز کا سورج طلوع کرتی ہے۔علیزہ کی زندگی میں بہت کچھ ایسا ہوا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ہوا اور ہو کر گزر گیا۔ہونے اور گزرنے کے درمیان پنگیں لیتی ہے علیزہ جو پہلے بہت پہلے کم گو تھی، سہمے سمٹے ماحول کی دبی کچلی لڑکی تھی ہر ایک ٹھوکر کو اپنا مقدر مان کر چلنے والی سیدھی سادھی لڑکی جب اپنے ہی توسط سے اپنی شناخت کرتی ہے تو اس عورت کو پہچانتی ہے۔جس کی گود میں آدم کی نسلیں پروان چڑھی ہیں۔وہ اپنے اس وجود کے ساتھ اُٹھ کھڑی ہوتی ہے۔جسے اس نے کئی پردوں اور کئی پرتوں میں دفن کر رکھی تھیں۔طوفان اور زلزلے گزرنے کے رخ کے بعد جب نئی علیزہ پیدا ہوتی ہے تو جذبۂ اظہار کا دبا ہوا سیلاب امنڈ پڑتا ہے''۔۴۵

یہی وجہ ہے کہ ناول نگار نے علیزہ کو آخر میں فرحان ہو یا اعیان مرزا سے ملانے کے بجائے ان دونوں مردوں کو ہجر کے عذاب میں مبتلا کرتی ہے۔یہ ایک اشارہ ہے جو بدلتے ہوئے حالات کے رخ پر زناٹے دار طمانچہ ہے جسے نئی صدی کی نئی عورت نے مارا ہے۔جو دراصل جنریشن میں سماجی پابندیوں اور جنسی استحصال کے خلاف اعلانِ جنگ۔

یہاں علیزہ کی زبانی سنیے:

''آئینہ میں طلوع ہوتے سورج کی شادابی لیے جو عورت تھی، میں اس سے نا آشنا تھی۔
میں ایک مکمل عورت تھی۔
میں اداسی نہیں تھی۔
میں اس آزادی کے ساتھ جینا چاہتی تھی جیسے کوئی مرد جیتا ہے
میں صدیوں کا کرب بھوگتی رہی۔۔۔
میں نے انگڑائی لی۔۔۔صندل سے زیادہ حسین بانہیں ہوا میں لہرائیں۔۔۔
میں نے گنگناتی موجوں کی طرح آئینہ میں ایک بار پھر اپنے چہرے کو دیکھا۔۔۔
اور وہ اچانک چونک گئی۔۔۔آئینہ میں میرے قدموں کے پاس دو کیڑے تھے جو مردہ حالت میں پڑے تھے۔۔۔[۴۶]

یہاں ناول نگار کو مرد ذات سے نفرت نہیں ہے اور نہ ہی عورتوں کو اس کے بغیر مکمل مانتی ہے۔مگر عام طور پر مردوں کا رویہ جو عورتوں کے ساتھ ہوتا ہے وہ بڑا ہے تکلیف دہ ہے۔بہتر ہوگا کہ یہاں یہ اقتباس کو درج کریں:

''جب رات اپنی چادر پھیلا دیتی تو چپکے ان اذیت بھرے لمحوں میں خود کو سمجھا یا کرتی۔فرحان مرزا اور اعیان مرزا ہی تو مرد نہیں ہیں۔کوئی ضروری نہیں ہے کہ دنیا کے سارے مردوں کے چہرے ایک جیسے ہوں۔''[۴۶]

علیزہ کی زندگی میں فرحان اور اعیان دو مرد آتے ہیں۔مگر دونوں صرف جنسی بھوکے نکلتے ہیں۔ایک نئے شک کی بنیاد پر سوچے بغیر طلاق کہہ کر اپنی زندگی سے آزاد کیا تو وہیں اپنے بھائی سے سمجھا کے حلالہ کرواتا ہے تاکہ پھر اسے پا سکے۔تو دوسری طرف اعیان اس کے جسم کو ایک بدتر طریقے سے استعمال کیا۔اس کو جب چاہا زندگی سے باہر پھینک دیا۔جب چاہا اپنایا جائے۔مردوں کا یہ چہرہ اسے بڑا گھناؤنا لگتا ہے۔پھر بھی علیزہ کے دل میں مردوں کے لیے اس کے لیے ایک نرم گوشہ کہیں ضرور ہوتا ہے۔تو ناول نگار فرحان اور اعیان جیسے مرد کو تخلیق کر کے مردوں کیخلاف آواز اُٹھانا انکا مقصد تھا۔

اس ناول میں ایک پیغام بھی واضح ہے کہ اب مرد خولِ انا سے نکل جائے کیونکہ جدید دور کی سائنسی ترقی نے عورتوں کو بھی پیچھے نہیں رکھا۔علیزہ نے ٹسٹ ٹیوب بے بی کے ذریعہ بچی پیدا کرتی ہے۔کیونکہ تنہا زندگی کاٹنا مشکل ہے۔جینے کے لیے کچھ تو سہارا چاہیے۔چاہے مرد ہو یا عورت تنہا زندگی کاٹ نہیں سکتے۔اس کو جینے کا سہارا چاہیے جس کے لیے اس نے ٹسٹ ٹیوب بے بی کا عمل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

اس ناول میں دوسری طرف دیکھا جائے تو شائستہ فاخری نے مذہب کے نام پر کیے جانے والے عورت کے استحصال کو موضوع بنایا ہے،ایک اقتباس دیکھیے :

> ''میں ان دونوں کا تجزیہ آرام سے کرسکتی ہوں۔ایسا نہیں کہ میں مذہب کے خلاف ہوں۔۔مگر مذہب کے انجکشن جس طرح سے ایسے ماحول میں نو جوان بچیوں کو لگائے جاتے ہیں۔اب ان کے مفہوم بھی واضح ہو چکے ہیں۔خاندانی وقار،عزت وناموس کی دبائیاں صرف لڑکیوں کیلیے ہوتی ہیں۔اس لیے ان کے لیے کبھی کبھی اپنے ہی آنگن تنگ ہوجاتے ہیں۔اپنا سائبان بھی اپنا نہیں لگتا۔اپنی چھت بھی اپنی نہیں لگتی۔اور اپنا گھر بھی۔۔۔۔۔''۴۸

شائستہ فاخری نے یہاں مذہب کے نام پر فائدہ اُٹھانے والے مرد فرحان جیسا کردار کو ثابت کیا ہے۔جو گناہ انہوں نے سوچے سمجھے بغیر طلاق دے کر پھر اسے پانے کے لیے اپنے ہی بھائی سے دوبارہ نکاح کرواتا ہے تاکہ بات کہیں باہر نہ جائے اور پھر اسے پاسکے۔مگر مذہبِ اسلام نے جہاں ایک طرف عورت کو آزادی دی ہے تو دوسری طرف مردوں کے لیے بھی کچھ ہدائتیں دی ہیں۔مذہب کے نام پر فائدہ اُٹھانے والے مرد جو فرحان جیسا کردار کو شائستہ نے ہم کو متعارف کروایا ہے۔اور آگے چلکر ایک مضبوط عورت کو جنم دیا اور جو آج کی تہذیب ومعاشرہ میں عورت کچھ بھی کرسکتی ہے۔کسی بھی حد تک جاسکتی ہے۔وہ خود اپنے خوابوں کا گھر بنا کر اس میں جی سکتی ہے۔

آخر کار شائستہ فاخری نے اس ناول کے ذریعہ اکیسویں صدی کی عورت کے وجود اور اس کے کارناموں سے ہمیں آگاہ

کیا ہے۔ جو شکستِ خوردہ عورت کی فتح کی کہانی ہے۔ جو مرد اساس معاشرے کے بنائے اصولوں کے خلاف کھڑی ہوتی ہے تو نئی صدی کی نئی عورت کی تصویر ہمارے سامنے آتی ہے۔ ایسی تصویر پر جو ہمیں نئے معاشرے سے روشناس کراتی ہے۔

---

حوالہ:۔

۱۔ نال نادیدہ بہاروں کے نشاں، ص۱۴۶
۲۔ ایضاً، ص۱۳۰
۳۔ ایضاً، ص۵۷
۴۔ ایضاً، ص۵۰
۵۔ ایضاً، ص۶۲
۶۔ ایضاً، ص۷۶
۷۔ ایضاً، ص۱۲۳
۸۔ ایضاً، ص۱۴۸
۹۔ ایضاً، ص۱۱
۱۰۔ ایضاً، ص۱۵۱
۱۱۔ ایضاً، ص۱۵
۱۲۔ نادیدہ بہاروں کے نشاں، بیک کور
۱۳۔ سید ضمیر جعفری، مشمولہ شائستہ فاخری سے ادبی مکالمہ، ماہنامہ چہارسو، پاکستان، مئی۔ جون ۲۰۵۱، ص۱۲
۱۴۔ نال نادیدہ بہاروں کے نشاں، ص۳۹
۱۵۔ ایضاً، ص۴۸
۱۶۔ ایضاً، ص۴۸
۱۷۔ ایضاً، ص۱۰۹
۱۸۔ ایضاً، ص۱۲۹
۱۹۔ ایضاً، ص۱۳۵

۲۰؎ ایضاً، ص ۵۴

۲۱؎ ایضاً، ص ۳۱

۲۲؎ ایضاً، ص ۳۶

۲۳؎ ایضاً، ص ۴۶

۲۴؎ ایضاً، ص ۴۶

۲۵؎ ایضاً، ص ۱۱۲

۲۶؎ ایضاً، ص ۱۱۰

۲۷؎ ایضاً، ص ۳۱

۲۸؎ ایضاً، ص ۳۷

۲۹؎ ایضاً، ص ۵۴

۳۰؎ ایضاً، ص ۹۲

۳۱؎ ایضاً، ص ۳۸

۳۲؎ ایضاً، ص ۲۵

۳۳؎ ایضاً، ص ۶۹

۳۴؎ ایضاً، ص ۱۹

۳۵؎ ایضاً، ص ۲۶

۳۶؎ ایضاً، ص ۱۰۶

۳۷؎ ایضاً، ص ۱۳۳

۳۸؎ ایضاً، ص ۱۴۲

۳۹؎ ایضاً، ص ۴۳

۴۰؎ ایضاً، ص ۱۲۳

۴۱؎ ایضاً، ص ۲۹

۴۲؎ ایضاً، ص ۱۱۴

۴۳؎ ایضاً، ص ۱۵۸

۴۴؎ ایضاً، ص ۱۵۸

۴۵؎ ایضاً، ص ۱۲۶

۴۶؎ ایضاً، ص ۱۳۷

۴۷؎ ایضاً، ص ۱۵۳

۴۸؎ ایضاً، ص ۱۴۱

# ماحصل

شائستہ فاخری کا تعلق دائرہ شاہ محمد اجمل کے مشہور صوفی گھرانے سے ہے۔ان کی پیدائش ۱۷ نومبر ۱۹۶۳ء کو سلطان پور (یوپی) میں ہوئی۔ان کا بچپن پیری، مریدی کے ماحول میں پروان چڑھا۔وہ بچپن ہی سے اپنے بھائی بہنوں میں بالکل مختلف تھیں۔انھیں لوگوں سے ملنا جلنا اچھا نہیں لگتا تھا۔جہاں تک ہو سکے وہ بھیڑ سے بچنے کی کوشش کرتی تھیں۔ یہ ان کی شخصیت کا ایک اہم عنصر ہے۔اس کے علاوہ وہ ایک حساس خاتون ہیں۔جنہیں ازدواجی زندگی کی ناکامی نے اور بھی حساس بنا دیا۔

شائستہ فاخری نے تعلیم سنسکرت زبان میں حاصل کی ہیں۔ایک مشہور صوفی گھرانے سے تعلق رکھنے والی خاتون کا شعور اردو میں نہیں بلکہ ہندی میں جاگا۔انہوں نے سنسکرت زبان میں پوری پوری تعلیم حاصل کرنے کی سعی کی۔

شائستہ فاخری نے نہایت کم سنی ہی میں افسانے لکھنے شروع کر دیئے تھے۔وہ ابھی ساتوں جماعت کی طالبہ تھیں جب انھوں نے اپنا افسانہ 'آلنگن' لکھا۔اس کے بعد وہ پے در پے کہانیاں لکھنا شروع کیں۔انٹرمیڈیٹ کے ختم ہونے تک ان کے پاس کہانیوں کا ایک مجموعہ ''سندی بیلا'' موجود تھا۔

شائستہ فاخری کا ادبی سفر ہندی زبان سے شروع ہوا لیکن انہیں کہیں نہ کہیں مادری زبان کی کشش اپنی طرف کھینچی چلی آ رہی تھی۔تو انہوں نے اردو میں بھی لکھنا شروع کیا۔اور اردو میں ''ہرے زخم کی پہچان'' اور ''اداس لمحوں کی خودکلامی'' افسانوی مجموعے منظرِ عام پر آئے۔لیکن شائستہ فاخری اس تیزی سے لکھ رہی ہیں کہ انھوں نے اردو کے کسی بھی صنف کو نہیں چھوڑا ہے۔چناں چہ افسانہ، ناول، ڈرامہ، شاعری، تراجم وغیرہ ان کی کئی تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔اور انہیں ادبی خدمات کے سلسلے میں کئی انعامات بھی ملے ہیں۔

اکیسویں صدی کی معروف فکشن نگار خاتون شائستہ فاخری نے اردو ہو کہ ہندی ادب میں کئی کتابیں لکھی ہیں۔لیکن انہیں شہرت افسانہ نگاری کے وجہ سے حاصل ہوئی ہے۔ان کے افسانوں کے موضوعات کا کینوس بہت وسیع ہے۔ان کے افسانوں میں آزادئ نسواں، مظلوم عورت کی بے چارگی، مردوں کا ظلم، زندگی کی الجھنیں، پریشانیاں، مغربی و مشرقی طرز کی

ناہمواریاں جیسے موضوعات کو بیانیہ انداز میں پیش کیا ہے۔لیکن انہوں نے جس کسی موضوع پر بھی قلم اُٹھایا عورت ان کے یہاں حاوی کردار بن کر سامنے آتی ہے۔وہ عورت کو بیدار کرانا چاہتی ہیں جو زندگی سے مایوس اور اپنی بات کہنے سے خوف زدہ ہوتی ہے۔ایسی عورتوں میں وہ ایک نیا شعور بیدار کرانا چاہتی ہے۔سنو رقیہ باجی ایک ایسا افسانہ ہے جس پر خواب چرائے جانے کا الزام لگایا جاتا ہے۔وہ عورت جس کو خواب دیکھنے کا حق بھی حاصل نہیں ہے۔وہ واقعات کا بڑی باریک بینی سے مشاہدہ کرتی ہیں۔ان کے یہاں جنسی مسائل،نفسیاتی شعور،سماجی مسائل،نئی صدی کی ابھرتی ہوئی تہذیب کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ہم انکار نہیں کر سکتے۔

ان کے افسانوں میں عورت ہر روپ میں نظر آتی ہے۔کہیں ماں کی شکل میں ممتا ہے تو کہیں بیوہ کے رنگ میں وفا،اور کہیں فریب خوردہ محبوبہ اور کہیں زمانے کی ستائی ہوئی عورت کی شکل میں نظر آتی ہے۔ان کے کئی افسانوں میں عورت کا عکس دیکھنے کو ملتا ہے۔کہیں کہیں تصوفانہ رنگ بھی دکھائی دیتا ہے۔عورت کی جوانی کے بہکتے جذبات بھی۔ایک آدھ افسانہ مرد اساس معاشرے پر بھرپور طنز اور عورت کے قوتِ برداشت کا بھی مظہر ہے۔

شائستہ فاخری کا خاص استعارہ خواب ہے،مثال کے طور پر ان کے افسانے سنو بار قیہ باجی،حرف حرف صاحب کا دن جیسے افسانے اس تکنیک میں لکھی ہیں۔

شائستہ فاخری کے دو ناول منظرِ عام پر آئے۔ان ہی سے ایک ناول ''نادیدہ بہاروں کے نشاں'' ہے۔یہ ناول اپنے موضوع کے اعتبار سے الگ ہی نہیں کافی حد تک نیا بھی ہے۔اس میں ایک مظلوم عورت کی کہانی بیان کی گئی ہے جو دو مردوں کے درمیان میں پھنس کر اپنی شناخت ڈھونڈتی ہے۔آخر وہ ان کے خلاف احتجاج کرتی ہے۔جو دراصل سماجی ہندھواں اور مذہب کا نام پر عورت کو لوٹنے والوں مردوں کے خلاف احتجاج ہے۔وہ ان دونوں مردوں سے الگ ہو کر جینے کا ایک سہارا یوں ڈھونڈ لیتی ہے کے ٹسٹ ٹیوب بے بی سے بچی پیدا کر لیتی ہے۔اور یوں وہ دو مردوں کو پیغام دیتی ہے کہ عورت کو جینے کے لیے مرد کی ضرورت نہیں ہے۔بالفاظ دیگر ''بہت ہو گیا بس اب اور نہیں''۔

شائستہ فاخری نے نئے تجربوں اور نئے احساسات کے ساتھ خود کو اپنی تحریروں میں ڈھالا ہے۔ان کی کہانیاں

زیادہ تر خود کلامی سی لگتی ہے۔ایسا لگتا ہے کہ وہ فن کار ان واقعات کا حصہ ہے۔ان کی تحریروں کی خوبی یہ ہے کہ وہ سادہ اور سلیس زبان لکھتی ہیں۔اس کے باوصف کے یہاں علامتی انداز اور شاعرانہ طرز بھی جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ایسا لگتا ہے یہ ایک طرح کی نثری نظمیں ہیں۔یہ ان کی تحریروں کی خاص خوبی ہے۔

---

## کتابیات:


| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| ۱۔ابوالکلام قاسمی ڈاکٹر | ناول کا فن | ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس | علی گڑھ | ۲۰۰۱ء |
| ۲۔احمد صغیر ڈاکٹر | اردو افسانے کا تنقیدی جائزہ | ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس ، | دہلی | ۲۰۰۹ء |
| ۳۔اسلم آزاد | اردو ناول آزادی کے بعد | نکھار پبلیکیشنز | | ۱۹۸۱ء |
| ۴۔حمیرہ سید ڈاکٹر | اردو ناول میں نسائی حسیت | | | |
| ۵۔خالد اشرف | برصغیر میں اردو ناول | غالب اپارٹمنٹس، | دہلی | ۱۹۹۵ء |
| ۶۔شائستہ فاخری | اداس لمحوں کی خود کلامی | ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس ، | دہلی | ۲۰۱۱ء |
| ۷۔شائستہ فاخری | چوبیس زبانوں ہندوستانی کہانیاں | عرشیہ پبلیکیشنز، | دہلی | ۲۱۰۲ء |
| ۸۔شائستہ فاخری | صدائے عندلیب برشاخِ شب | ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، | دہلی | ۲۰۱۴ء |
| ۹۔شائستہ فاخری | نادیدہ بہاروں کے نشاں | عفیف پرنٹرس، | دہلی | ۲۰۱۳ء |
| ۱۰۔شائستہ فاخری | ہرے زخم کی پہچان | اتر پردیش، | لکھنؤ | ۱۹۹۲ء |
| ۱۱۔صالحہ صدیقی | اردو ناول میں تانیثیت کی مختلف جہتیں | افیف پرنٹرس | دہلی | ۲۰۱۴ء |
| ۱۲۔فہمیدہ کبیر | اردو ناول میں عورت کا تصور | مکتبہ جامعہ لمیٹڈ | دہلی | ۱۹۹۲ء |
| ۱۳۔گوپی چند نارنگ پروفیسر | اردو افسانہ روایت اور مسائل | ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، | دہلی | ۱۹۸۱ء |
| ۱۴۔گوپی چند نارنگ پروفیسر | نیا اردو افسانہ انتخاب، تجزیہ اور مباحث | ادارہ فروغ اردو | لکھنو | ۱۹۸۱ء |
| ۱۵۔محمد احسن فاروقی ڈاکٹر | اردو ناول کی تنقیدی تاریخ | سرسوتی آفسٹ | الہ آباد | ۱۹۱۹ء |
| ۱۶۔محمد نظام الدین | تاریخِ مشائخِ الہ آباد | سرسوتی آفسٹ، | | ۱۹۱۹ء |
| ۱۷۔نورالحسن ہاشمی | ناول کیا ہے | نسیم بک ڈپو | لکھنو | ۱۹۸۷ء |

۱۸۔یوسف سرمست ڈاکٹر بیسویں صدی میں اردو ناول نیشنل بک ڈپو مچھلی کمال ۱۹۷۳ء

رسائل:

۱۔اجمل کمال آج پاکستان مارچ ۲۰۱۳ء
۱۔افتخار امام صدیقی شاعر ممبئی مارچ ۲۰۱۲ء
۳۔خورشید ماہنامہ آجکل نئی دہلی اکتوبر ۲۰۱۴ء
۳۔ضمیر جعفری سید چہارسو (ماہنامہ) پاکستان مئی، جون ۲۰۱۵ء

لغت

۱۔فیروزالدین مولوی فیروز اللغات اسلامک پبلیشرز دہلی ۲۰۰۵ء